جلد ۷۹ | نومبر، دسمبر ۱۹۹۵ء | شمارہ ۔ ۶

اس شمارے میں

ناشر: احمدیہ انجمن اشاعت اسلام (لاہور) یو ایس اے
پتہ: ۱۳۱۵ کنگز گیٹ روڈ، کولمبس، اوہائیو ۱۵۰۴ - ۴۳۲۲۱ (یو ایس اے)

حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی دینی خدمات

(۵)

۲۱۔ جہاد بالسیف:۔ کسی صداقت کو منوانے کے لئے براہین و دلائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ جبرو اکراہ کی نہیں جس سے صرف منافقت پیدا ہو سکتی ہے۔ اسی لئے قرآن شریف نے سورہ بقرہ ۲ آیت ۲۵۶ میں فرمایا:۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (ترجمہ) دین میں کوئی زبردستی (منوانا) نہیں۔ اسی طرح سورہ ۱۰ یونس کی آیت ۹۹ میں فرمایا:۔ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (ترجمہ) تو کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا یہاں تک کہ وہ مومن بن جائیں۔ کفار البتہ جبرو اکراہ سے کام لیتے رہے اور نبی کریم صلعم کی دعوت پر مسلمان ہونے والوں پر تیرہ سال ایسے ایسے مظالم ڈھاتے رہے کہ اللہ کی پناہ۔ لیکن مسلمانوں کو پھر بھی ہجرت کا حکم ہوا لڑنے کی اجازت نہیں ملی۔ جب مسلمانوں کی یہ چھوٹی سی جماعت ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ چلی گئی اور مکہ والوں نے دیکھ لیا کہ اسلام اپنے ماننے والوں کے دلوں میں ایسا گھر کر لیتا ہے کہ اسے کسی صورت مٹایا نہیں جا سکتا تو انہوں نے ان مٹھی بھر مسلمانوں کو یکسر ختم کرنے کے لئے ان سے کئی گنا زیادہ تعداد کی فوج سے مدینہ پر چڑھائی کر دی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو دین کی حفاظت کے لئے جنگ کرنے کی اجازت دی چنانچہ سورہ ۲۲ حج کی آیات ۳۹ اور ۴۰ میں فرمایا:۔ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ○ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ (ترجمہ) ان لوگوں کو اجازت دی گئی جن سے لڑائی کی جاتی ہے اس لئے کہ ان پر ظلم کیا گیا اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے اور وہ اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے۔ لیکن اس جنگ پر دو حد بندیاں عاید کر دیں اول سورہ بقرہ ۲ آیت ۱۹۰ میں فرمایا وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ○ (ترجمہ) اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور زیادتی نہ کرو۔ اللہ زیادتی کرنے والوں سے پیار نہیں کرتا۔ اور دوسرے اسی سورہ کی آیت ۱۹۳ میں فرمایا:۔ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ (ترجمہ) اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لئے ہو۔ پہلی آیت سے صاف ظاہر ہے کہ یہ جنگ مدافعت ہے جس کی اجازت ملی ہے۔ جو تم سے جنگ کرتے ہیں ان سے جنگ کرو۔ جو آپ سے جنگ نہیں کرتے ظاہر ہے ان سے جنگ کرنا زیادتی ہے۔ اور فرمایا کہ اللہ زیادتی کرنے والوں سے پیار نہیں کرتا۔ دوسری آیت میں تصریح فرما دی کہ جنگ کرو یہاں تک کہ مومنوں کی ایذا رسانی کا خاتمہ ہو جائے اور دین اللہ کے لئے ہو جائے یعنی مذہبی آزادی کامل طور پر حاصل ہو جائے۔ ان واضح ہدایات کے باوجود کچھ مولویوں کی ناسمجھی سے اور کچھ پادریوں کے پراپیگنڈے کے اثر سے مسلمانوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی کہ گویا جہاد کے معنی ہیں تلوار سے اشاعت دین کرنا۔ حضرت مرزا صاحب نے اس غلط فہمی کو دور کیا کہ اسلام میں مذہب کے لئے جنگ کرنا خاص حالات اور خاص شرائط کے ساتھ جائز ہے۔ جب وہ حالات اور شرائط موجود نہ ہوں تو مذہب کے لئے جنگ کرنا جس کا دوسرا نام جہاد بالسیف ہے جائز نہیں بلکہ یہ اعتدا یعنی حد سے بڑھ جانا ہے جو خدا کو پسند نہیں۔ یہ بھی فرمایا کہ لَا شَکَّ اِنَّ وُجُوْهَ الْجِهَادِ مَعْدُوْمَةٌ فِيْ هٰذَا الزَّمَنِ وَهٰذِهِ الْبِلَادِ (ضمیمہ تحفہ گولڑویہ صفحہ ۳۰) یعنی جہاد کی شرائط اس زمانہ میں اور اس ملک میں نہیں پائی جاتیں۔ اس واضح عبارت کے باوجود حضرت مرزا

صاحب کے خلاف جھوٹا پراپیگنڈا کیا گیا کہ آپ نے جہاد کے حکم کو منسوخ کیا۔ افسوس تو یہ ہے کہ یہ الزام لگانے والے وہ لوگ ہیں جو قرآن شریف میں ناسخ منسوخ کے قائل ہیں۔ حضرت مرزا صاحب تو اس کے قائل نہیں تھے۔ اپنی تصنیف "نشان آسمانی" کے صفحہ ۲۹ پر فرماتے ہیں "اور اس بات پر محکم ایمان رکھتا ہوں کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں اور آنجناب کے بعد اس امت کے لئے کوئی نبی نہیں آئے گا۔ نیا ہو یا پرانا اور قرآن کریم کا ایک شوشہ یا نقطہ منسوخ نہیں ہو گا۔"

۲۲۔ جہاد بالقرآن:۔ الغرض حضرت مرزا صاحب نے مسئلہ جہاد کے متعلق غلط فہمی کو رفع کیا اور بتایا جہاد بالسیف ایک وقتی چیز ہے اور شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔ اصلی جہاد جس کا قرآن کریم میں حکم ہے وہ ہے جہاد بالقرآن جیسا کہ سورہ ۲۵ فرقان کی آیت ۵۲ میں آتا ہے وَجَاهِدْهُم بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا ○ اور اس (قرآن) کے ساتھ ان سے (وہ) جہاد کر (جو) بڑا جہاد ہے۔ یعنی قرآن ہی وہ زبردست حربہ ہے جسے ہاتھ میں لے کر مسلمانوں کو باطل کی فوج پر حملہ آور ہونا چاہئے۔ خود حضرت مرزا صاحب کا یہی معمول تھا کہ جب کسی اہم مسئلہ پر لکھنے کی ضرورت پیش آتی تو اسے ذہن میں رکھ کر سارا قرآن شریف پڑھ جاتے تھے اور ساتھ ساتھ وہ آیات بھی نوٹ کرتے جاتے جو اس مسئلہ پر روشنی ڈالنے والی ہوتیں۔ اس زمانے میں جب کہ مغربی اقوام ساری دنیا پر چھائی ہوئی ہیں اور ہر طرف کفر کا غلبہ ہے جہاد بالقرآن کو رواج دینا آپ کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ آپ نے مسلمانوں کو اس جہاد پر لگا کر ان میں وحدت پیدا کرنے کا رستہ دکھایا۔ آپ نے فرمایا کہ فقہی فروعی مسائل پر مسلمانوں کا باہم لڑنا جھگڑنا اپنے آپ کو کمزور اور برباد کرنا ہے۔ اختلافی مسائل دراصل وسعت دین پر دلالت کرتے ہیں اس وسعت کو تنگی نہیں بنانا چاہئے۔ اگر کسی نے آمین زور سے کر لی اور کسی نے آہستہ تو اس پر جھگڑا کرنا غلطی ہے۔ مسلمانوں کو ان فروعی مسائل پر وقت ضائع کرنے کی بجائے قرآن کریم کو ہاتھ میں لے کر جہاد میں مصروف ہو جانا چاہیئے۔ حضرت مرزا صاحب کو جو خود اس میں شغف تھا اس کی ایک مثال سنئے۔ جب حضرت مولانا نور الدین صاحب نے آپ کی بیعت کی تو عرض کی کہ سب اہل اللہ اپنے مریدوں کو کوئی وظیفہ تزکیہ نفس کے لئے بتاتے ہیں۔ آپ مجھے کیا وظیفہ بتاتے ہیں۔ فرمانے لگے جہاد۔ مولوی صاحب حیران رہ گئے۔ عرض کی کہ کیا تلوار لے کر کافروں سے لڑوں۔ فرمایا نہیں کافروں سے جہاد بالقرآن کرو۔ عرض کی کس طرح۔ فرمایا۔ عیسائیت کے رد میں ایک کتاب لکھو۔ اس پر حضرت مولانا نے عیسائیوں کے تین سو میں سے ڈیڑھ سو اعتراضات کے جوابات لکھ کر "فصل الخطاب" کے نام سے کتاب شائع کی۔ حضرت مرزا صاحب بہت خوش ہوئے۔ حضرت مولانا صاحب نے پھر پوچھا اب کیا کروں۔ فرمایا جہاد۔ اب آریوں کے خلاف ایک کتاب لکھو۔ چنانچہ مولانا نے لیکھرام کی کتاب "تکذیب براہین احمدیہ" کے خلاف "تصدیق براہین احمدیہ" لکھی۔ اس میں عیسائیوں کے بقیہ ڈیڑھ سو اعتراضات کا جواب بھی آگیا۔

۲۳۔ اصل اسلامی جہاد۔ حضرت مرزا صاحب کے نزدیک جہاد کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) انفرادی جہاد۔ قرآن شریف سورہ ۲۹ عنکبوت آیت ۶۹ میں فرماتا ہے وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (ترجمہ) اور جو لوگ ہمارے لئے جہاد یعنی جدوجہد کرتے ہیں ہم یقیناً انہیں اپنے رستوں پر چلائیں گے۔ تو یہ جہاد تزکیہ نفس کے لئے ہے جو ہر مسلمان کو اپنی انفرادی حیثیت سے کرنا چاہئے (۲) جہاد بالسیف۔ اس کا تفصیلی ذکر اوپر نمبر ۲۱ میں آچکا اور شرائط کے ساتھ مشروط ہے اور جیسا حضرت مرزا صاحب نے فرمایا یہ شرائط ان کے زمانہ میں ہندوستان میں نہیں پائی جاتیں تھیں۔ (۳) اجتماعی جہاد۔ جو انفرادی یا اجتماعی طور پر ہر وقت مسلمانوں کو

کرنے کا حکم ہے جیسا سورہ آل عمران ۳ کی آیت ۱۰۴ میں فرمایا

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ (ترجمہ)

چاہئے کہ تم میں سے ایک جماعت ہو جو بھلائی کی طرف بلائیں اور اچھے کاموں کا حکم دیں اور برے کاموں سے روکیں اور وہی کامیاب ہونے والے ہیں۔ یہ دعوت الی الخیر جہاد بالقرآن ہے جس کے لئے مسلمانوں کو ہر وقت ایک جماعت تیار رکھنے کا حکم ہے۔ یہ کسی شرط کے ساتھ مشروط نہیں۔ جب تک مسلمانوں کا اس پر عمل رہا ترقی کرتے رہے اور جب ادھر سے غافل ہو گئے تنزل نے آ لیا۔ اسی حکم کی طرف حضرت مرزا صاحب نے مسلمانوں کو توجہ دلائی اور جب انہیں غافل پایا تو اس کام کے لئے ایک جماعت کی بنیاد ڈالی اور ان سے "دین کو دنیا پر مقدم رکھنے کا عہد" لے کر اس دعوت الی الخیر کے کام پر لگا دیا۔ افسوس کہ جن لوگوں نے خود کوئی کام نہیں کرنا ہوتا انہوں نے اس قرآنی حکم کی تعمیل کو فرقہ بندی کا نام دے دیا۔ کاش کہ اس حکم کی تعمیل کا کوئی بہتر طریقہ تجویز کرتے اور اس پر عمل کر کے دکھاتے۔ اس جہاد بالقرآن کی کامیابی کے لئے ضروری تھا کہ مسلمانوں میں قرآن کی تعلیم کا بندوبست ہوتا۔ اس کے لئے حضرت مرزا صاحب نے دو طریق اختیار کئے۔ ایک تو یہ کہ کتابوں، رسالوں اور ٹریکٹوں کے ذریعے تعلیم قرآن کو عام کیا اور دوسرے اپنی جماعت میں درس قرآن کی ایسی مضبوط بنیاد رکھی کہ اسے زندگی کا جزو بنا دیا۔ جہاں کہیں جماعت ہے وہاں درس قرآن بھی ہے۔ اس کا ایک اچھا اثر ہوا کہ دوسرے لوگوں نے بھی درس قرآن کو اپنا لیا ہے۔

جہاد بالقرآن کو کامیاب بنانے کے لئے آپ نے کئی اقدامات کئے۔ مثلاً

ایک یہ کہ ہدایت دی کہ قرآن شریف کی متشابہ آیات کو سمجھنے کے لئے انہیں محکم آیات کے ماتحت کرو۔ محکمات اصل ہیں اور عقائد کی بنیاد انہیں پر ہے۔ اسی لئے حضرت مرزا صاحب کی تفسیر کے سامنے ہر عقلمند کا سر جھک جاتا تھا۔

دوسرے یہ کہ جیسا نمبر ۱۲ میں ذکر ہو چکا ہے آپ نے واضح اعلان کیا کہ قرآن شریف کی کوئی آیت منسوخ نہیں۔ ایک شوشہ یا نقطہ منسوخ نہیں ہو گا۔ یہ جو سورہ ۲ بقرہ کی آیت ۱۰۶ میں آتا ہے مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا (ترجمہ) جو پیغام ہم منسوخ کرتے ہیں یا اسے فراموش کرا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسا لے آتے ہیں۔ اس میں قرآن کریم کی کسی آیت یا حکم کی منسوخی کا ذکر نہیں بلکہ سابقہ شرائع کی منسوخی کا ذکر ہے۔ مسلمان مفسرین جب قرآن شریف کی دو آیتوں کو تطبیق نہ دے سکے ایک کو ناسخ اور دوسری کو منسوخ قرار دے دیا۔ جو تطبیق دے سکے انہوں نے ناسخ منسوخ کو قبول نہیں کیا۔ چنانچہ بعض علماء تو 500 آیتوں تک کی منسوخی کے قائل تھے اور بعض اس سے کم کے۔ شاہ ولی اللہ محدث صرف پانچ آیتوں کی منسوخی کے قائل تھے باقی سب میں تطبیق مانتے تھے۔ حضرت مرزا صاحب یا آپ کے شاگردوں نے ان پانچوں آیتوں میں بھی تطبیق دے کر ثابت کر دیا کہ قرآن شریف کی کوئی آیت منسوخ نہیں۔

تیسرے یہ کہ قرآن شریف کو سمجھنے کے لئے حضرت مرزا صاحب نے تعلیم یافتہ طبقے کے مسلمانوں کو خصوصاً اور عام مسلمانوں کو عموماً عربی زبان سیکھنے کی ترغیب دی۔ فرمایا کرتے تھے کہ آج کل جس طرح دنیاوی کاروبار کے لئے انگریزی زبان سیکھنے کی ضرورت ہے اسی طرح اپنے مذہب کو ٹھیک طرح سے سمجھنے اور اس کے ساتھ محبت اور تعلق رکھنے کے لئے ایک مسلمان کے واسطے ضروری ہے کہ وہ عربی سیکھے۔ اس ضمن میں حضرت مرزا صاحب نے ۱۸۹۵ء میں یہ اعلان کر کے علمی دنیا کو حیران کر دیا کہ عربی زبان ہی ام الالسنہ ہے یعنی ابتدا میں انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو زبان سکھائی گئی وہ عربی تھی۔ آگے پھر جس طرح نسل انسانی دنیا میں

پھیلتی گئی اور مختلف اطراف ارض میں آباد ہوتی گئی زبانوں میں بھی اختلاف ہوتا گیا۔ اس موضوع پر آپ نے ایک کتاب "منن الرحمٰن" کے نام سے تصنیف فرمائی اس کے اشتہار میں آپ نے تمام عیسائیوں اور آریوں کو اس تحقیقات کے متعلق چیلنج کیا ہے کہ وہ اپنی اپنی مفروضہ ام الالسنہ زبانوں کو عربی کے مقابلہ میں لا کر فیصلہ کریں۔ اس کتاب میں حضرت مرزا صاحب نے عربی کے ام الالسنہ ہونے کے لئے پانچ وجوہ تحریر فرمائے۔ سنئے:- "(۱) عربی کے مفردات کا نظام کامل ہے (۲) عربی اعلیٰ درجہ کے علمی وجوہ تسمیہ پر مشتمل ہے جو فوق العادت ہیں۔ (۳) عربی کا سلسلہ اطراد مواد الفاظ اتم واکمل ہے (۴) عربی کی تراکیب میں الفاظ کم اور معانی زیادہ ہیں۔ (۵) عربی زبان انسانی ضمائر کا پورا نقشہ کھینچنے کے لئے پوری پوری طاقت اپنے اندر رکھتی ہے"۔ حضرت مرزا صاحب نے اس کتاب کے لئے بہت مواد اکٹھا کیا تھا لیکن ان کی توجہ کو دوسرے امور نے اپنی طرف جذب کر لیا۔ آپ کی وفات کے بعد یہ کتاب نہایت نا تمام حالت میں شائع ہوئی۔ نا معلوم وہ تمام مسودات اور ذخیرہ مفردات جو حضرت مرزا صاحب نے اکٹھے کئے تھے کہاں گئے۔ بہر حال جس قدر حصہ چھپا وہ بھی اس قدر زبردست دلائل پر مشتمل ہے کہ اسی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اگر یہ کتاب تکمیل کو پہنچ جاتی تو علم السنہ میں کیسا انقلاب پیدا ہو جاتا۔

چوتھے یہ کہ قرآن شریف کی تعلیم زیادہ تر مسلمانوں تک محدود تھی لیکن حضرت مرزا صاحب نے اپنی کتاب "فتح اسلام" میں جس میں مسیح موعود کے دعوے کا اعلان کیا اس میں یہ بھی لکھا کہ میرے دل میں یہ آرزو ہے کہ قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ اور تفسیر کر کے تمام انگریزی جاننے والی قوموں میں پہنچاؤں۔ آپ کی اس آرزو کو آپ کے خدام نے تکمیل تک پہنچایا۔

راقم الحروف مزید لکھنا چاہتا ہے کہ یورپ اور امریکہ کے متعلق "ازالہ اوہام" کے صفحہ ۷۷۳ پر حضرت مرزا صاحب نے تحریر فرمایا "سو میری صلاح یہ ہے کہ بجائے ان واعظوں کے عمدہ عمدہ تالیفیں ان ملکوں میں بھیجی جائیں۔ اگر قوم بدل و جان میری مدد میں مصروف ہوں تو میں چاہتا ہوں کہ ایک تفسیر بھی تیار کر کے اور انگریزی میں ترجمہ کرا کر ان کے پاس بھیجی جائے۔ میں اس بات کو صاف صاف بیان کرنے سے رہ نہیں سکتا کہ یہ میرا کام ہے دوسرے سے ہرگز ایسا نہیں ہو گا جیسے مجھ سے یا جیسا اس سے جو میری شاخ ہے اور مجھ میں ہی داخل ہے۔" یہ کام حضرت مولانا محمد علی امیر جماعت احمدیہ لاہور نے پورا کیا اور ان کا انگریزی ترجمہ اور تفسیر ۱۹۱۷ء میں انگلستان میں چھپ کر شائع ہوا۔ اس ترجمہ و تفسیر کے متعلق سید مدثر شاہ صاحب گیلانی پشاوری نے اپنی کتاب "عقائد احمدیہ متعلق نبوت محمدیہؐ" میں ایک واقعہ لکھا ہے۔ آپ بھی سن لیجئے۔ ۳ مارچ ۱۹۱۴ء کو حضرت حکیم نورالدین صاحب نے ایک اشتہار شائع فرمایا جس میں اس انگریزی ترجمہ کے چندہ کے لئے اپیل کی گئی تھی۔ اگلے دن یعنی ۴ مارچ ۱۹۱۴ء کو حضرت حکیم صاحب نے ان لوگوں کو جو اس وقت آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے فرمایا کہ ہمارا انگریزی ترجمہ اللہ کو مقبول ہو گیا ہے۔ الہاماً بشارت آ گئی ہے "قرآن کا ختم مبارک ہو۔ اس کا انکار نہ کریو۔" یہ الہام جماعت کے ایک بزرگ ملہم کو ہوا تھا۔ جس وقت حضرت حکیم صاحب نے یہ بشارت سنائی تو جتنے لوگ موجود تھے سب کے سب سوائے ایک کے سجدہ میں گر گئے۔ اس ترجمہ اور تفسیر کے مبارک ہونے کو تو ایک دنیا نے تسلیم کر لیا ہے۔ کئی مفسرین اور نقادوں نے اس کی تعریف کی ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں اس کی اشاعت ہو چکی ہے۔ اس تفسیر کے تراجم ڈچ۔ فرانسیسی، انڈونیشی، جاوی اور سپینش زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ انشاء اللہ اس کے روسی اور چینی تراجم کے بھی چھپ جانے کی امید ہے۔ جرمن اور پولش تراجم ٹائپ سٹ کے مرحلے میں ہیں۔ اس کے علاوہ اطالوی۔ ترکی۔ افریکان اور یوگوسلاویہ کی زبانوں میں تراجم کے لئے بیشتر مترجمین کا انتخاب ہو چکا ہے۔

۲۴۔ اپنے نمونہ سے نبیوں کے وجود پر دلیل:۔ اللہ تعالیٰ نے تمام قوموں کی اصلاح کے لئے ان میں نبی بھیجے۔ آہستہ آہستہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان میں آپس کے اختلافات رونما ہو گئے اور ایک دوسرے کو نفرت اور حقارت سے دیکھنے لگیں۔ جب دنیا میں آپس کے میل جول کی راہیں آسان ہو گئیں تو اللہ تعالیٰ نے تمام دنیا کے لئے ایک ہی نبی محمد رسول اللہ صلعم اور ایک ہی کتاب قرآن مجید بھیج کر اخوت نسل انسانی کو قائم کیا۔ چونکہ تمام ہدایات کو جو بذریعہ وحی الٰہی نسل انسانی کو دینی ضروری تھیں قرآن کریم میں جمع کر دیا اور ان پر عمل کرنے کے لئے نبی کریمؐ کی ذات بابرکات میں کامل نمونہ بنا دیا۔ اس لئے آئندہ نہ کسی نئی ہدایت یعنی کتاب کی ضرورت رہی اور نہ اسے لانے والے نبی رسول کی۔ اب ساری دنیا صرف اسی ایک نبیؐ اور اسی ایک کتاب کے اتباع کے لئے مکلف رہ گئی۔ اس طرح وحدت نسل انسانی کی راہ ہموار ہو گئی۔ چوں کہ آئندہ نبیوں کے آنے کا سلسلہ بند ہو گیا اس لئے ہر نئے نبی کے آنے پر اس کے انکار سے جو کافر بننے کا خدشہ تھا وہ بھی جاتا رہا اور اب قیامت تک بجائے کافر بنانے کے مسلمان بنانے کا کام باقی رہ گیا۔ لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ دل سخت ہو جاتے ہیں جیسا کہ قرآن شریف سورہ حدید ۵۷ آیت ۱۶ میں آتا ہے **فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ** (ترجمہ) پھر ان پر لمبا زمانہ گزر گیا تو ان کے دل سخت ہو گئے۔ اس لئے ضروری تھا کہ آخری نبوت یعنی نبوت محمدیہ صلعم مختلف اوقات میں اپنے فیضان سے اپنے متبعین میں سے ایسے لوگوں کو پیدا ہونے کا باعث ہوتی رہے جو دین کی تجدید کرے یعنی تمام بدعات سے پاک کر کے دین خالص انسان کے ہاتھ میں دے اور تعلیم قرآن و سنت اور تزکیہ نفوس اس کا کام ہو اور اسلام کی حفاظت اور اشاعت اس کا فرض ہو۔ پہلے یہ کام انبیاء کا تھا اب تکمیل دین کے بعد یہی کام امت مسلمہ (یعنی اس کے کامل افراد) کے سپرد ہوا جیسا کہ قرآن شریف سورہ ۲۲ حج آیت ۷۸ میں فرماتا ہے **هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَ فِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ** (ترجمہ) اس نے تمہارا نام پہلے سے اور اس (قرآن) میں بھی مسلم رکھا تاکہ رسولؐ تمہارا پیش رو ہو اور تم لوگوں کے پیش رو بنو۔ یہ طبعی امر تھا کہ یہ امت کے کامل افراد زمانہ کی ضرورتوں اور مختلف اصلاحات کے تقاضہ کی وجہ سے مختلف انبیاء سے مناسبت اور مماثلت رکھتے ہوں کیوں کہ ہر ایک نبی کسی خاص ضرورت اور خاص اصلاح کی خاطر مبعوث ہوتا تھا لیکن نبوت محمدیہؐ تمام کمالات نبوت کی جامع ہے۔ آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری۔ یہی مطلب ہے اس حدیث کا کہ **عُلَمَاءُ أُمَّتِيْ كَأَنْبِيَاءِ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ** یعنی میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے نبیوں کی طرح ہوں گے۔ (راقم الحراف مزید لکھنا مناسب سمجھتا ہے کہ یہ حدیث اسی طرح سے مشہور ہے لیکن سند کے ساتھ ابو داؤد جلد دوم کتاب العلم باب نمبر ۱ صفحہ ۱۵۷ پر جو الفاظ آتے ہیں وہ اس طرح ہیں **ان العلماء هم ورثة الانبياء** یعنی علم نبیوں کے وارث ہیں) انہی علماء ربانی کو حدیث میں مجدد کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے جیسا کہ فرمایا **اِنَّ اللهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْأُمَّةِ عَلٰى رَاْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَنْ يُّجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا** یعنی اس امت میں اللہ تعالیٰ ہر صدی کے سر پر ایک شخص کو مبعوث کرتا رہے گا جو اس امت کے دین کی تجدید کرتا رہا گا (ابو داؤد جلد ۲ ص ۲۴۱ کتاب الملاحم)۔ حضرت مرزا صاحب نے بھی اسی مجددیت کا دعویٰ کیا اور کام کی مناسبت سے آپ کا نام مسیح موعود رکھا گیا جیسا کہ فرماتے ہیں "اور یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مسیح موعود ہونے کا دعویٰ ملہم من اللہ اور مجدد من اللہ کے دعوے سے کچھ بڑا نہیں ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ جس کو یہ رتبہ حاصل ہو کہ وہ خدا تعالیٰ کا ہمکلام ہو اس کا نام منجانب اللہ خواہ مثیل مسیح اور خواہ مثیل موسیٰ ہو یہ تمام نام اس کے حق میں جائز ہیں۔" (آئینہ کمالات اسلام ص ۳۴۱)۔ ایک شعر بھی حضرت مرزا صاحب کا سنیئے:۔

چوں مرا نورے پئے قوم مسیحی دادہ اند
مصلحت را ابن مریم نام من بنہادہ اند

چونکہ مجددین کا کام منہاج نبوت پر ہوتا ہے اس لئے ان کے وجود میں انبیاء کی جھلک نظر آتی ہے گو وہ نبی نہیں ہوتے۔ یہی جھلک حضرت مرزا صاحب کی زندگی میں نظر آتی ہے۔ آپ کا دعویٰ آپ کی تعلیم قرآن و سنت۔ آپ کے پاکیزہ اخلاق اور نمونہ اور آپ کا تزکیہ نفوس فرمانا۔ آپ کا حفاظت و اشاعت اسلام کا کام۔ اس میں انہماک۔ لوگوں کی مخالفت۔ اس کے بالمقابل آپ کا صبر اور استقامت۔ آپ کے ہاتھ پر نشانات آسمانی اور خدا تعالیٰ کی نصرت کا کثرت سے ظہور اور بالآخر آپ کی اپنے مقاصد میں کامیابی اور مخالفوں کی ناکامی وغیرہ وغیرہ جو واقعات انبیاء کے تذکروں میں لکھے ہوئے ہیں وہ سب کچھ آپ کے ساتھیوں نے آنکھوں سے دیکھ لیا۔ پس حضرت مرزا صاحب اگرچہ نبی نہ تھے بلکہ مجدد تھے لیکن آپ کا وجود نبیوں کے وجود پر دلیل بن کر ظاہر ہوا۔

۲۵۔ تمام قوموں میں رسولوں کی بعثت اور ان کی عصمت:

اللہ تعالیٰ کی جسمانی ربوبیت سورج چاند بارش اناج غلہ پھل لباس وغیرہ کی شکل میں دنیا کی ہر ایک قوم کے ساتھ نظر آتی ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اس کی روحانی ربوبیت کسی خاص قوم تک محدود ہو۔ بد قسمتی سے تمام اقوام میں یہ خیال رائج ہو گیا کہ نبوت اور رسالت صرف انہیں کا حصہ ہے اور کسی قوم میں کوئی نبی رسول نہیں آیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر کوئی شخص اپنا مذہب تبدیل کرتا تو اپنے پرانے مذہب اور مذہبی معتقدات کو خیرباد کہتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے جب قرآن مجید کے ذریعہ اسلام کو ایک عالمگیر مذہب کی شکل میں پیش کیا تو ساتھ ہی اس بنیادی اصول کی بھی تعلیم دی کہ ہر قوم میں نبی اور رسول آتے رہے ہیں۔ سورہ یونس ۱۰ آیت ۴۷ میں آتا ہے وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ۔ (ترجمہ) اور ہر ایک قوم کے لئے رسول ہے۔ اسی طرح سورہ ۳۵ فاطر کی آیت ۲۴ میں ہے وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ۔ (ترجمہ) اور کوئی قوم نہیں مگر اس میں ڈرانے والا گذر چکا۔ ان سب پر ایمان لانا مسلمانوں کے لئے ضروری قرار دیا۔ سورہ ۲ بقرہ آیت ۲۸۵ میں فرمایا اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ۔ (ترجمہ) رسول اس پر ایمان لایا جو اس کے رب سے اس کی طرف اتارا گیا اور مومن (بھی) سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں۔ ہم اس کے رسولوں میں سے کسی میں کچھ تفرقہ نہیں کرتے۔ اسی طرح تمام قوموں کو ان کے انبیاء کے ذریعے حکم دیا گیا تھا کہ وہ ان کے مصدق رسول یعنی حضرت محمد مصطفٰے صلعم پر ضرور ایمان لائیں اور ضرور اس کی مدد کریں۔ سنئے سورہ ۳ آل عمران آیت ۸۱۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا۔ (ترجمہ) اور جب اللہ نے نبیوں کے ذریعے سے عہد لیا کہ جو کچھ میں نے تمہیں کتاب اور حکمت سے دیا ہے پھر تمہارے پاس وہ رسول آئے جو اس کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمہارے پاس ہے تو تم نے ضرور اس پر ایمان لانا ہو گا اور ضرور اس کی مدد کرنی ہو گی۔ کہا، کیا تم اقرار کرتے ہو اور اس پر میرے عہد کا بوجھ لیتے ہو، انہوں نے کہا ہم اقرار کرتے ہیں۔۔۔ اب کسی مذہب کا پیرو اگر رسول کریمؐ پر ایمان لاتا ہے تو اسے اپنے رسول اور اپنی کتاب کو خیرباد نہیں کہنا پڑتا بلکہ تمام رسولوں اور تمام کتابوں پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ یہ عالمگیر صلح کی بنیاد ہے۔ حضرت مرزا صاحب نے اس زمانہ میں تمام اقوام کو اس زریں اصول کی طرف توجہ دلا کر ان پر حجت تمام کر دی۔ یہ وہ تبلیغی کارنامہ ہے جو حضرت مرزا صاحب سے ظہور میں آیا۔

اس کے ساتھ ساتھ حضرت مرزا صاحب نے عصمت انبیاء کے عقیدہ پر بھی بہت زور دیا۔ مسلمانوں میں بہت سے بزرگ اس کے قائل تھے جن میں حضرت امام رازی کا پایہ بہت بلند ہے۔ لیکن حضرت مرزا صاحب نے اس مسئلہ پر ایک خاص بات جو پیدا کی وہ ذنب اور استغفار دونوں الفاظ کی توضیح و تشریح ہے۔ آپ نے لغت عرب سے یہ ثابت کیا کہ ذنب کے معنے نہ صرف گناہ کے ہیں بلکہ ان کمزوریوں کے بھی ہیں جن میں انسان کے مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اسی طرح استغفار ہے جو غفر سے ہے جس کے معنی ہیں ڈھانپ لینا۔ حفاظت کرنا۔ پس استغفار کے معنے ہوتے حفاظت کرنا گناہوں کے بدنتائج سے اور آئندہ کسی انسانی کمزوری میں مبتلا ہو کر گناہ کا مرتکب ہو جانے سے۔ انبیاء کے متعلق قرآن کریم سورہ ۲۱ انبیاء آیت ۲۷ میں فرماتا ہے لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ (ترجمہ) وہ بات میں اس سے آگے نہیں بڑھتے اور اس کے حکم کے مطابق وہ عمل کرتے ہیں۔ لہذا انبیاء کے استغفار ذنب کے معنے فقط اس قدر ہوتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے حفاظت طلب کرتے رہتے ہیں کہ کسی بشری کمزوری میں مبتلا ہو کر وہ کسی گناہ کے مرتکب نہ ہو جائیں۔ یہ ان کے عصمت کے مقام پر کھڑا ہونے کی وجہ سے ہے۔ انبیاء کے سوا دوسرے لوگ جو عصمت کے مقام پر نہیں جب استغفار ذنب کرتے ہیں تو اس میں دونوں مفہوم ہوتے ہیں یعنی پچھلے گناہوں کے بدنتائج سے حفاظت اور آئندہ گناہوں کے ارتکاب سے حفاظت۔ انبیاء کرام معصوم ہونے کے باوجود ہمہ وقت استغفار کرتے رہتے ہیں کیوں کہ۔

ہر کہ عارف تراست ترساں تر

ان کے اندر تکبر نہیں ہوتا کہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی حفاظت سے بے نیاز سمجھیں۔ بلکہ وہ اپنی معصومیت کو بھی اللہ تعالیٰ کی حفاظت کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور اس لئے ہر وقت اس کے آگے جھکے رہتے ہیں۔ دیگر قوموں نے بد قسمتی سے انبیاء کی طرف بڑے بڑے شرمناک گناہ منسوب کئے ہیں۔ حضرت مرزا صاحب اور آپ کے شاگردوں نے بہت سے بائبل کے انبیاء کی طرف منسوب شدہ گناہوں کی صحیح تشریح کر کے ان کے دامن کو پاک ثابت کیا۔

اسلام میں تصوف

[حال ہی میں آفتاب الدین احمد چیریٹیبل ٹرسٹ، لاہور نے Mysticism in Islam یعنی "اسلام میں تصوف" کے نام سے ۱۳۵ صفحات پر مشتمل ایک کتاب شائع کی ہے جس میں حضرت خواجہ کمال الدین صاحب مرحوم و مغفور کی ان تقاریر اور جوابات کو کتابی صورت میں شائع کیا ہے جو انہوں نے ۱۹۲۲ سے ۱۹۲۶ کے دوران انگلستان کی سپریچویل سوسائٹیز اور دیگر علمی مجالس میں روحانیات کے موضوع پر دئے۔ اس کتاب میں دیباچہ کے طور پر مولانا محمد یعقوب خان صاحب مرحوم اور مولانا آفتاب الدین احمد صاحب مرحوم کے دو مضامین شامل کئے گئے ہیں اول الذکر مضمون کا اردو ترجمہ کیپٹن عبدالسلام خان صاحب کی قلم سے قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے یہ لیکچر مولانا محمد یعقوب خان صاحب مرحوم نے ۱۵ اگست ۱۹۲۳ء کو "سمر سکول آف تھیالوجی" ٹرینیٹی کالج، آکسفورڈ کے جلسہ میں دیا جس کی صدارت ڈاکٹر اسٹلن جے کار پنٹر، ایم اے، ڈی لٹ، ڈی ڈی نے کی۔ دوسرے مضمون کا ترجمہ آئندہ شمارے میں شائع کیا جائے گا۔ ایڈیٹر]

انگریزی زبان میں لفظ Mysticism کا خواہ کوئی بھی مفہوم ہو مگر اسلامی لٹریچر میں یہ لفظ "تصوف" کا مترادف ہے گو یہ کامل طور پر وہی مفہوم نہ رکھتا ہو مگر کم وبیش تصوف کے لفظ کے ہم پلہ ہے۔

اسلامی اصطلاح میں لفظ تصوف کی کیسے ابتدا ہوئی اس بارے میں کچھ کہنا خالی از دلچسپی نہ ہو گا۔ کچھ لوگ لفظ "تصوف" اور اس کے مشتق "صوفی" کو "اصحاب صفہ" سے نکلا ہوا سمجھتے ہیں۔ صوفی سے مراد ایسا شخص ہے جو روحانی کمالات کا مالک ہو۔ اصحاب صفہ رسول اکرم صلعم کے وہ صحابی تھے جو مسجد نبویؐ میں ایک چبوترے ("صفہ") پر بیٹھ کر دن گذارتے۔ ان کا کھانا پینا غرضیکہ سونا بھی وہیں ہوتا۔ وہ اپنی تمام قوت اور وقت حضور صلعم سے دین سیکھنے پر وقف کئے ہوتے تھے۔ بعد کے زمانے میں زیادہ عبادت گذار اور متقی لوگوں کو بھی "اصحاب صفہ" کی نسبت سے صوفی کہا جانے لگا۔ بعض لوگ صوفی کی اصطلاح کو "صوف" یعنی اون سے مشتق سمجھتے ہیں کیونکہ اکثر عیسائی راہب ایک لبادہ یا اونی چوغہ پہنتے تھے جو بندے کے گناہ کے غم سے بیزاری کے اظہار کا ایک طریق ہے۔ مگر ایسے مخصوص لباس صوفی سلسلوں میں لازمی علامت کے طور پر مقرر نہیں ہیں۔ اسی سلسلہ میں ایک اور بھی قیاس کیا جاتا ہے یعنی صفا کا مطلب تزکیہ نفس لیا جاتا ہے اس لئے کہ صوفی وہ شخص ہے جس کی لوح دل مصفا ہو چکی ہو۔ تاہم ایک جدید عالم کی رائے میں صوفی یونانی لفظ "صوف" سے نکلا ہوا ہے جس کا مطلب علم و معرفت ہوتا ہے۔ تصوف لفظ خواہ کسی لفظ سے بھی نکلا ہو مگر اس کے مفہوم کے متعلق کوئی اختلاف نہیں۔ اشیاء کی حقیقت کا ادراک صوفی کی نظر میں تنہا انسانی عقل کی پہنچ سے بالا ہے۔ مختصراً یہ تصوف کی غرض و غایت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اسلام کی تعلیمات پر مبنی ہے اور ہر لحاظ سے اسلامی رنگ رکھتا ہے بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ یہ دین اسلام کی اعلیٰ ترین توجیہہ ہے یعنی انسان کو ان روحانی رفعتوں تک پہنچاتا ہے جہاں وہ "حق" کا مکمل ادراک اور مشاہدہ کر سکتا ہے۔

صوفی تحریک

پیشتر اس کے کہ ہم اس عظیم اسلامی سچائی پر مزید روشنی ڈالیں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ صوفی تحریک کا بحثیت ایک مخصوص مسلک اور روحانی سلسلہ، اس کی ابتدا، فروغ اور پھر اس کے زوال کا جائزہ لیا جائے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ صوفی سلسلہ شریعت کی اس شدت، رسم پرستی اور کھوکھلے ظاہرپن سے بیزاری اور رد عمل کے طور پر وجود میں آیا۔ شریعت کے نافذ کرنے والوں کا زیادہ تر زور ظاہری عبادات اور ارکان کے بجالانے پر تھا خواہ اس طریق پر روحانی تزکیہ نفس کا مقصد حاصل ہو یا نہ ہو جو کہ شریعت کی اصل غرض ہونی چاہیئے۔ صوفیا جو اہل نظر تھے اور ظاہر کے پیچھے چھپی ہوئی اصلیت اور حقیقت پر نظر رکھتے تھے اور مغز اور چھلکے کے فرق کو خوب سمجھتے تھے وہ ملا اور پیشہ ور واعظوں کی ظاہرداری اور رسمی عبادات کے بجا لانے سے سخت بیزار تھے۔ صوفی کی نظر میں ملا کی ظاہری اور رسمی طور پر عبادت بجالانا بے سود اور بے نتیجہ تھی اور وہ اس ڈھونگ کو مطعون کرنے سے نہ چوکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفی اور ملا ہمیشہ آپس میں متصادم رہے ہیں۔ ملا نے جو کہ اکثر حکومت وقت کا منظور نظر رہا ہے شرعی اور رسمی قانون کی سختیوں کو بروئے کار لاتے

ہوتے صوفی کو ہدف تنقید بنایا اور اسے اکثر ذلت اور مقاطعہ حتیٰ کہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ یہ کہانی حضرت مسیحؑ اور فریسیوں کی داستان سے ملتی جلتی ہے۔ امام غزالی کو صوفی خیالات کا سب سے بڑا شارح اور علمبردار سمجھا جاتا ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے اس سلسہ کے طریقوں کو وضع کیا۔ مختصراً امام غزالی کی تشریح کچھ یوں ہے۔

شریعت کی طرح طریقت کے بھی دو حصے ہیں پہلا علم اور دوسرا عمل۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ شریعت میں علم عمل پر اولیت رکھتا ہے جبکہ طریقت میں علم عمل کے نتیجہ میں حاصل ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان تعلیم، استدلال اور ذہن کی دیگر کارروائیوں کے ذریعہ علم حاصل کرتا ہے اور اس کے بعد اس پر عمل پیرا ہوتا ہے اور یہ عمل حاصل کردہ علم کی بنیاد پر ہوتا ہے مگر تصوف کے طریق میں امام کے نزدیک علم ایک برق تجلی کی طرح حاصل ہوجاتا ہے۔

کرہ ارض پر انسانی زندگی کی غرض و غایت، اس کی ابتداء اور انتہا کیا ہے۔ یہ ایسے سوالات ہیں جو تمام تر کوششوں کے باوجود انسانی عقل کو پریشان کئے ہوتے ہیں کوئی سائنسی تحقیق، کوئی فلسفیانہ کلام، کوئی مافوق الفطرت قیاس آرائی اس مشکل کا حتمی حل پیش نہ کرسکی۔ انسانی نظر اور عقل مادی محسوسات کی چار دیواری تک محدود ہے۔ ہم چاہیں تو اس کی مدد سے مادی دنیا میں کتنی ہی بلندی تک پہنچ جائیں لیکن ہم پھر بھی اپنے آپ کو بے یقینی، شک اور مبہم خیالات کی دھند میں سرگرداں پاتے ہیں۔ ہمارے تخیلات کی زیادہ سے زیادہ اڑان بھی ہمیں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتاتی کہ اس تمام نظام کائنات اور اس کے مظاہر کے پیچھے کوئی آفاقی ذہن (Universal Mind) ضرور ہونا چاہیئے۔ مگر یہ بھی تو ایک قیاس غالب ہے نہ کہ ایک یقینی علم۔ "ہونا چاہیئے" اور "ہے" کے درمیان جو خلیج ہے وہ تو بدستور قائم رہی۔ یہ صوفی کا روحانی ادراک ہے جو آگے بڑھ کر اس خلیج کو پاٹ دیتا ہے اور باطنی مشاہدہ سے "ہونا چاہیئے" "ہے" میں بدل دیتا ہے اور یہ ادراک اسے خاص لمحات میں حاصل ہوتا ہے۔ ہم اسے خواہ تجلی کہیں یا وجدان یا الہام یا وحی۔ اب وہ شک اور بے یقینی کی لہروں پر تھپیڑے نہیں کھارہا ہوتا بلکہ ہر چیز روز روشن کی طرح اس پر عیاں ہو جاتی ہے اور اسے اشیاء کی حقیقت نظر آنے لگتی ہے۔

امام غزالی اس نکتہ کو مندرجہ ذیل تمثیل کے ذریعہ واضح فرماتے ہیں:-

"ایک دفعہ رومی اور چینی مصوروں کے درمیان مقابلہ ہوا۔ ہر دو فریق بضد تھے کہ وہی اس فن کے ماہر ہیں۔ بادشاہ نے دونوں کو ان کا ہنر آزمانے کے لیئے بلایا اور دونوں کو دو متقابل دیواروں پر نقاشی کے کام پر لگا دیا تاکہ وہ ایک دوسرے کی نقل نہ کرسکیں درمیان میں ایک پردہ لٹکا دیا گیا تاکہ وہ ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل رہیں۔ چند روز بعد رومیوں نے بادشاہ کو مطلع کیا کہ ان کا کام مکمل ہوگیا ہے اور اس کے ساتھ ہی چینیوں نے بھی یہی کہا! جب پردہ اٹھایا گیا تو معلوم ہوا کہ دونوں مرقعات میں سرمُو فرق نہ تھا۔ ایک مرقع دوسرے کی ہو بہو نقل تھا! بعد میں معلوم ہوا کہ رومیوں نے بجائے اس کے کہ خود مصوری کرتے اپنی طرف کی دیوار کو خوب سیقل کر دیا تھا اور جب پردہ ہٹا تو یہ سیقل شدہ دیوار سامنے والی تصویر کو بعینہٖ منعکس کر رہی تھی۔"

امام غزالی کے بھاری بھرکم مقالات اسلامی تصوف کے بارہ میں معیاری کتب سمجھی جاتی ہیں ان میں انسانی شعور کی اور اس کے مختلف رنگوں، جذبات، شہوات، قوائی ارادی کی باریک تجزیہ نگاری کی گئی ہے اور ہر قسم کی اخلاقی اور روحانی بیماری کا توڑ تجویز کیا گیا ہے!

اسی مسلک کی ایک اور اہم شخصیت مولانا جلال الدین رومی ہیں وہ بھی مندرجہ بالا تمثیل کا حوالہ دے کر کہتے ہیں کہ انسان کا دل جب اس طرح سیقل اور مصفا ہو جاتا ہے تو وہ مہبط انوار الہیٰ بن جاتا ہے! ان کی مشہور زمانہ مثنوی کو "هست قرآن در زبان پہلوی" یعنی فارسی زبان میں قرآن مجید کہا جاتا ہے!

اسلامی تاریخ کے صفحات ان نورانی اور روحانی ہستیوں کے وجود سے جگمگا رہے ہیں۔ ایرانیوں میں سے عطار، حافظ، سعدی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ہر مسلمان ملک میں یہ روشنی کے مینار پائے جاتے ہیں۔ ھند کے روحانی افق پر بھی معین الدین چشتی، نظام الدین اولیا، علی ہجویری "گنج بخش" اور بہاالدین ذکریا اور دیگر بہت سے نورانی لوگوں نے اس خطہ کو نور بخشا اور ان کی قبور آج بھی اس قدیم روحانی سرزمین کی زینت بنیں اور مرجع خاص و عام ہیں۔ ان کے زائرین میں غیر مسلم اور مسلم دونوں شامل ہیں۔ ان صوفیا کے کلام میں شیرینی پائی جاتی ہے۔ "حسن محبوب" جو کہ ان کی تمام کوششوں کا مقصود ہے کو وہ اس طرح سراہتے ہیں جیسے کسی معشوق کی شان میں کوئی عاشق نغمہ سرا ہو! اسی طرح وجدانی لمحات کی مختلف روحانی

لذتوں کو شراب سے تشبیہ دی جاتی ہے، یا باد نسیم سے۔ "آفاقی ذات" کے ساتھ متعدد مدارج کے تعلقات کو بیان کرنے کے لیئے انہوں نے اپنی ایک اصطلاح فرہنگ ایجاد کی ہوتی ہے۔ ان سحر انگیز نغموں کے مندرجہ ذیل نمونے ملاحظہ فرمائیں:-

علم گر بر دل زنی یارے بود
علم گر بر تن زنی مارے بود

یعنی دل کی معرفت تمہارے لئے ایک پیارا دوست ہے اور جسم کا علم سانپ بن کر تم کو ڈسے گا۔ جسمانی علوم ان کے لئے ایک بوجھ ہے اہل دل لوگوں کا علم ان کو بلند کرتا ہے۔

ایکہ خواندی حکمت یونانیاں
حکمت روحانیاں راہم بخوان

یعنی کب تک تو یونانیوں کی حکمت کو سیکھنے میں وقت ضائع کرو گے، آ ایمان کی حکمت بھی سیکھ۔ جہاں تو نے ایک عمر صرف و نحو سیکھنے میں صرف کی ہے وہاں آ اور عشق خدا کا سبق پڑھ۔

"کوئی علم خدا کی محبت اور معرفت کے سوا کچھ حقیقت نہیں رکھتا تمام دیگر علوم شیطان کا دھوکہ ہیں۔" (بہاؤ الدین)

"تم ایک فلسفی تو بن گئے ہو لیکن تمہیں یہ علم نہیں کہ تم کہاں سے آئے، کہاں ہو اور تم کیا ہو

ان سینکڑوں کتابوں اور اوراق کو آگ میں پھینک دو اور اپنے دل اور روح کو محبوب حقیقی کی طرف موڑ دو۔ تم اپنے دل میں کسی کتاب، معلم یا استاد کی مدد کے بغیر انبیاء کے علم کو پاؤ گے"۔

(مولانا روم)

یہ عظیم روحانی شخصیتیں جو کہ "حق" اور صرف "حق" کی متلاشی تھیں کھوکھلی اور نمائشی عبادات کو رد کرنے میں بالکل حق بجانب تھیں۔ خود قرآن بھی اس قسم کی نمائش کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ گو کہ پنجگانہ نماز ہر مسلمان پر فرض ہے تاہم قرآن شریف اس بارے میں فرماتا ہے۔

"کیا تو نے اس شخص کی حالت پر غور کیا ہے جو دین کو جھٹلاتا ہے یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔ پس ان نمازیوں کے لئے تباہی ہے جو اپنی نماز سے غافل ہیں۔" (۵-۱: ۱۰۷)

نماز محض ایک رسم کے طور پر کوئی عبادت نہیں۔ اگر یہ روحانی بلندیوں پر نہیں پہنچاتی تو یہ بیکار محض ہے! حضور صلعم نے فرمایا "نماز مومن کی معراج ہے"! معراج کا مطلب زینہ ہے پس نماز وہ زینہ ہے جو مومن کو روحانی بلندیوں تک پہنچاتا ہے۔ اسی طرح ایک دفعہ حضور صلعم نے اپنے صحابہ سے پوچھا۔ اس شخص کے بارہ میں تمہاری کیا رائے ہے جس کے گھر میں ایک شفاف نہر بہتی ہو اور وہ اس میں پانچ مرتبہ غسل کرے؟ "یہی حالت اس شخص کی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا" جو کہ پنجگانہ نماز ادا کرتا ہے!"

یہ ان مذہبی عبادات کی اصل حقیقت ہے بشرطیکہ ان کی صحیح روح کو مدنظر رکھ کر ادا کی جائیں۔

ذہنی اور جسمانی ہم آہنگی کے جدید نظریہ کی روشنی میں عبادات میں اختیار کیئے جانے والی مختلف جسمانی حالتیں اور منہ سے بار بار الفاظ کی ادائیگی اور دیگر حرکات سے اس کی افادیت کی تصدیق ہوتی ہے۔ بلاشک ان تمام اعمال اور حرکات کا ہماری ذہنیت پر اسی طرح کا اثر پڑے گا۔ اس لئے یہ تمام فرض عبادات ایک خاص مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ناگریز ذریعہ ہیں بالکل ایسے جیسے کہ کھانا جسم کو صحیح حالت میں رکھتا ہے۔ اس لئے ان تمام روحانی ہستیوں نے چاہے انہوں نے ہر چیز کی روح پر کتنا ہی زور دیا ہو کبھی بھی شریعت کی فرض عبادات کو نہیں چھوڑا۔

انہیں اعتراض صرف اس شخص پر تھا جو عبادت کو طوطے کی طرح رٹی ہوئی عبارتیں اور ظاہری رسوم کے طور پر ادا کرتا ہے اور یوں روحانی پستی اور زوال کا باعث بنتا ہے۔ بہر حال انسانی نشوونما کے لیئے شریعت ضروری ہے۔ صرف ضرورت اس امر کی ہے کہ شریعت کی روح اور مقصد کو ملحوظ خاطر رکھا جائے۔ تاہم صوفی کی اس خشک شریعت سے بیزاری نے کئی لوگوں کو شریعت میں شدت پسندی کے رجحان سے فرار کا جواز فراہم کر دیا۔ اس لئے کئی ایک کاہل اور نکمے لوگوں نے جنہیں شریعت کی منظم اور متوازن زندگی ناگوار تھی صوفی سلسلوں کا رخ کیا۔

صوفی تحریک کا تنزل

پس اس طرح صوفی تحریک تنزل کا شکار ہو گئی۔ عام طور پر وہ لوگ جو اس تحریک میں اس لئے شامل ہوتے تا کہ شریعت کی سختیوں سے نجات حاصل کریں ان میں وہ بنیادی روحانی شعلہ جو اس کا طرہ امتیاز تھا بجھ گیا۔

یہ تحریک جو شریعت کی سختی سے نفاذ کے خلاف بطور احتجاج کے ابھری تھی خود ایک بوجھ بن کر رہ گئی اور آہستہ آہستہ شرعی پابندیوں اور رسوم کا بدترین ذریعہ بن گئی۔ اس طرح قانون کی

ظاہری پابندی نے اس کی روح کی جگہ لے لی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اصطلاحات اور رسوم کا ایک بڑا ذخیرہ وجود میں آگیا اور اس قسم کی اصطلاحات وجود میں آئیں جن کا اسلامی شریعت کی روح سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ مثلاً ورد اور وظیفہ، پیر و مرشد، سلسلہ، سجادہ نشین، تسبیح، بیعت، سرود و وجد، ذکر بالجہر اور ذکر خفی، درویش اور فقیر، حال مست و ملنگ حال، غوث، قطب و ابدال، ولی، سالک، سر اور اس قسم کی سینکڑوں دیگر اصطلاحات وجود میں آئیں۔ اس طرح غزالی، رومی، حافظ اور دیگر صوفیوں کا روحانی مشاہدہ اس ڈھانچہ کے نیچے دب کر رہ گیا۔ ان کا تو نعرہ تھا کہ اسلامی سادگی کی طرف لوٹو۔ مگر ان کے بعد میں آنے والوں نے تو ملا کو بھی پیچھے چھوڑ دیا اور اسلام کی سادہ سچائی کے گرد رسوم و قیود اور اصطلاحات کا ایک نیا جال بن ڈالا۔

اسلامی دنیا کے تنزل و انحطاط میں ان خود رو صوفی سلسلوں کا بھی کافی ہاتھ تھا جو زوال پذیر اور فرسودہ ہو چکے تھے اور جگہ جگہ نظر آتے تھے۔ ان کے زیر اثر جو بھی آتا تساہل اور جمود کا شکار ہو جاتا۔ ایسی زندگی کا کیا فائدہ۔ ایسا صوفی تو صرف اگلی زندگی پر نظر رکھتا، اور جو بھی مقدر کی طرف سے اس کی زندگی میں آتا اسے خندہ پیشانی سے قبول کر لیتا۔ اس کی واحد کوشش پیر کے حکم کو ماننا ہے کیونکہ پیر صاحب کے خدا کے ساتھ ایک "پر اسرار" تعلق ہونے کی وجہ سے مرید کو خدا کے دربار سے خصوصی مراعات ملنے کی امید ہوتی ہے۔ اس طرح ایک مردانہ اور مجاہدانہ طریق زندگی کی اخلاقی کمر توڑ کر رکھ دی گئی۔

اسلامی زندگی کی جدوجہد کی جگہ ایک روگی، غیر صحت مند، عاجزی اور قناعت پسندی نے لے لی اور اسلام کی عام فہم طرز زندگی کو ایک جاہل پیر کی من کی موج کے تابع کر دیا گیا۔

روحانی زندگی کا بلند مقام

پھر بھی یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ تصوف جیسا کہ اس کے عظیم استادوں نے سوچا اور تدوین کیا تھا کی جڑیں قرآن کریم کی تعلیمات پر مبنی ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ تصوف کا اسلامی تصور روحانی زندگی کا اعلیٰ ترین نقطہ منتہا ہے۔ خدا تعالیٰ سے مکالمہ مخاطبہ اب بھی سب سے اعلےٰ انعام ہے جس سے کسی نیک روح کو نوازا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے:-

"وہ لوگ جو کہتے ہیں اللہ ہمارا رب ہے پھر سیدھے راہ پر جمے رہتے ہیں ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ تم نہ ڈرو اور نہ غمگین ہو اور اس جنت کی خوشی مناؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے!" (۳۰ : ۴۱)۔

مکالمہ مخاطبہ الٰہیہ اب بھی جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا اور اس کے ذریعہ خدا اپنے مخلص بندوں کے پاک و مصفی دل کو منور کرتا رہے گا۔ تصوف کی جو صورت اس سچائی پر پورا اترتی ہے اسلام کے بالکل مطابق ہے۔ بہر حال اس بات کا اعادہ لازمی ہے کہ تزکیہ نفس کے لئے صوفی سلسلوں کی مروجہ مشقوں اور حالتوں کو اسلام نہیں مانتا بلکہ اسلام میں صرف ایک ہی راستہ ہے جو خدا کی طرف لے جاتا ہے اور وہ ہے ایک اچھی اور نیک عملی کی زندگی، زندگی جو کہ فرائض کی ادائیگی، دیانت اور کار خیر سے بھرپور ہو۔ گویا وہ صفات الٰہیہ کا مظہر بن جائے۔ کوئی بھی انسان اگر ان صفات حسنہ کو حاصل کر لے اور اس سے زیادہ اچھی عملی زندگی کا اور کیا طریق ہو سکتا ہے! اور کہ نورِ الٰہی اس کے آئینہ دل سے منعکس ہو، جس طرح آفتاب کی کرنیں ایک مصفا آئینہ سے! حضور صلعم نے اسی حقیقت کو ایک اور رنگ میں بیان کیا ہے: "دنیا کی زندگی آخرت کا مزرعہ ہے!"

اس لیئے ہمیں روحانی بلندی حاصل کرنے کے لئے اس دنیا میں نیکی کی زندگی گذارنی چاہیئے۔ کوئی بھی طریق جو خدا کے مقرر کردہ نیک عملی کی سیدھی سادھی زندگی سے ہٹانا چاہے محض دھوکا اور فریب ہے۔ اگر کھیت میں محنت نہیں کی جائے گی تو فصل کیسے حاصل ہو سکتی ہے اسی طرح اگر نیک عملی کی زندگی نہیں ہو گی تو روحانیت کیسے حاصل ہو سکتی ہے۔

ایک سچا صوفی وہ ہے جس کی زندگی بھرپور، ہمہ رنگ اور قوت حیات سے لبریز ہو اور ساتھ ہی ساتھ پاک، شریفانہ اور معزز ہو۔۔۔۔ اور یہی انسان ایک سچا مسلمان ہوتا ہے!

(اسلامک ریویو، انگلستان اکتوبر ۱۹۲۳ء ص ص ۳۴۸ تا ۳۵۶)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ

حضرت سیدہ آمنہ

(۲)

سیدہ آمنہ کا عظیم الشان کشف

جب حضورؐ کی ولادت کا وقت آ گیا اور سیدہ آمنہ کو درد زہ شروع ہوا تو عین اس وقت آپ پر ایک کشفی حالت طاری ہوئی، اس عالم میں آپ نے جو کچھ دیکھا وہ خود بیان کیا ہے۔ چنانچہ فرماتی ہیں:۔

"میں اپنے مکان میں تنہا تھی اور عبدالمطلبؒ کعبہ کا طواف کر رہے تھے کہ میں نے ایک خوفناک دھماکے کی آواز سنی جیسے کوئی بہت بڑی دیوار گری ہو۔ یہ آواز سن کر میں ڈر گئی۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ سفید رنگ کا ایک پرندہ اترا اور اس نے اپنے بازو سے میرے دل کے مقام کو مس کیا، اس کے بعد میرا خوف دور ہو گیا اور میرا درد (درد زہ) بھی جاتا رہا۔ پھر میں نے ایک برتن میں سفید رنگ کا مشروب دیکھا۔ میں نے برتن اٹھا کر یہ مشروب پی لیا۔ اس کے بعد میں نے ایک نور کو اپنے قریب آتے دیکھا جو بہت بلند تھا۔ پھر میں نے کھجور کے درخت کی طرح دراز قد عورتیں دیکھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ عبد مناف کی بیٹیوں میں سے ہوں۔ یہ عورتیں میرے چاروں طرف جمع ہو گئیں۔ ان عورتوں کو دیکھ کر مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ انہیں میرا حال کیونکر معلوم ہو گیا۔"

ایک دوسری روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ سیدہ آمنہ فرماتی ہیں ان عورتوں میں سے بعض نے بتایا کہ ہم فرعون کی بیوی آسیہ اور عمران کی بیٹی مریم ہیں اور ہمارے ساتھ جو عورتیں ہیں یہ (جنت کی) حوریں ہیں۔ سیدہ آمنہ فرماتی ہیں کہ اس کے ساتھ ہی وہ خوفناک آواز پھر آنے لگی جو ابتدا میں آئی تھی اور مجھ پر پھر تکلیف کا وقت آ گیا۔ اسی دوران میں نے سفید رنگ کا ایک ریشمی کپڑا دیکھا۔ پھر اچانک میں نے ایک آواز سنی جیسے کوئی کہہ رہا ہو کہ جس وقت یہ (حضورؐ) پیدا ہوں تو تم انہیں لوگوں کی نگاہوں سے چھپا لو۔ سیدہ آمنہ فرماتی ہیں کہ (پھر) میں نے کچھ مردوں (ملائکہ) کو دیکھا جن کے ہاتھوں میں پانی کی نقرئی چھاگلیں تھیں اور وہ ہوا میں کھڑے ہوئے تھے۔

رسولؐ اقدس کی ولادت باسعادت

سیدہ حضرت آمنہ فرماتی ہیں کہ اس کے بعد کیا دیکھتی ہوں کہ پرندوں کا ایک غول آیا اور وہ اتنا قریب آ گیا کہ انہوں نے میرے مکان کو ڈھانپ لیا۔ ان پرندوں کی چونچیں زمرد کی اور بازو یاقوت کے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے میرے سامنے سے پردے اٹھا دیئے۔ زمین کا مشرق اور مغرب میرے سامنے آ گئے۔ میں نے دیکھا کہ تین جھنڈے گڑے ہوتے ہیں۔ ایک جھنڈا جانب مشرق دوسرا جانب مغرب اور تیسرا کعبہ مکرم کی پشت پر نصب تھا۔ سیدہ حضرت آمنہ فرماتی ہیں کہ اس کے بعد مجھے وہ درد شروع ہو گیا جو بچے کی ولادت کے وقت ہوتا ہے اور پھر حضورؐ اقدس دنیا میں تشریف لے آئے۔ (اس کے بعد پھر آپ سیدہ پر کشفی حالت طاری ہو گئی)۔ آپ فرماتی ہیں پھر میں نے دیکھا کہ (حضورؐ) سجدے میں پڑے ہوتے ہیں اور اپنی دونوں انگشت ہائے شہادت کو آسمان کی طرف عاجزی سے اٹھایا ہوا ہے۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ سفید رنگ کا ابر آسمان سے

آیا اور اس نے حضورؐ اقدس کو چھپا لیا اور آپؐ مجھ سے غائب ہو گئے۔ پھر میں نے ایک آواز سنی۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ اس (رسولؐ اقدس) کو زمین کے شرقی اور غربی اطراف کا طواف کراؤ۔ اس کے بعد وہ سفید ابر آپؐ پر سے ہٹ گیا۔

جناب خطیبؒ بغدادی نے اس حدیث کی روایت اپنی سند کے ساتھ اس طرح کی ہے کہ حضرت سیدہ آمنہ نے فرمایا کہ جب میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اپنے بطن مبارک سے جدا کیا تو کیا دیکھتی ہوں کہ ایک زبردست ابر چھا گیا جس میں سے نور پھوٹ رہا تھا۔ اس ابر میں سے کبھی گھوڑوں کے ہنہنانے اور کبھی پرندوں کے پروں کی حرکت کی آوازیں آتی تھیں اور کبھی میں ایسے فرشتوں کے کلام کرنے کی آوازیں سنتی تھی جن کی صورتیں مردوں کی سی تھیں حتیٰ کہ اس ابر نے آپؐ کو چھپا لیا اور آپؐ میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اتنے میں مجھے ایک آواز آئی۔ کوئی شخص کہہ رہا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ساری دنیا کا طواف کراؤ اور ہر ایک ذی روح کے سامنے اسے لے جاؤ یعنی انسان، حیوان اور جن اور ملائکہ سب کے روبرو کرو۔

(پھر آواز دینے والے یعنی فرشتے نے کہا کہ) حضرت آدمؑ کے اخلاق، حضرت شیثؑ کی معرفت، حضرت نوحؑ کی شجاعت، حضرت ابراہیمؑ کی خلیلی، حضرت اسماعیلؑ کی زبان، حضرت اسحاقؑ کی رضا، حضرت صالحؑ کی وضاحت بیان، حضرت لوطؑ کی حکمت، حضرت یعقوبؑ کی بشارت، حضرت موسےٰؑ کی قوت، حضرت ایوبؑ کا صبر، حضرت یونسؑ کی فرماں برداری، حضرت یوشعؑ بن نون کا جذبہ جہاد، حضرت داؤدؑ کا لحن، حضرت دانیالؑ کی محبت، حضرت الیاسؑ کا وقار، حضرت یحییٰؑ کی عصمت اور حضرت عیسیٰؑ کا زہد اس (حضورؐ اقدس) میں یکجا کر دو۔ (۱۸)

سیدہ آمنہ کے کشف کی حقیقت

سیدہ آمنہ نے حضورؐ اقدس کی ولادت کے وقت جو کشف دیکھا تو دراصل اس کشف کے ذریعے سیدہ کو بشارت دی گئی تھی کہ ان کے بطن مبارک سے جو فرزند پیدا ہو رہا ہے وہ کوئی معمولی انسان نہیں ہے بلکہ یہ وہ بزرگ ترین ہستی ہے جو ساری دنیا کو نور سے بھر دے گی۔ جس کا وجود نورانی بھی ہے اور نور تقسیم کرنے والا بھی ہے، جس سے مشرق و مغرب میں آباد قومیں برکت پائیں گی، جو انسانوں اور حیوانوں سب کے لئے رحمت و شفقت کا پیکر بن کر ظاہر ہو گا جس میں سارے انبیاء کے کمالات جمع کر دئے جائیں گے۔ جس پر بڑے بڑے مصائب کے طوفان امنڈ امنڈ کر آئیں گے مگر اللہ تعالیٰ اپنے ملائکہ کے ذریعے اس کی تائید فرمائے گا اور مصیبت کا ہر طوفان پارہ ابر کی طرح اڑ جائے گا اور آخر کار اسی کی عظمت و کامرانی کا سورج ضو فگن ہو گا۔ وہ غلاموں کا دستگیر ہو گا، جبر کے پتھروں تلے سسکتی ہوئی صنف نازک کو آزادی اور عزت کے مرتبے پر فائز کرے گا، غلاموں کو حروں (آزادوں) کا آقا بنا دے گا۔ انسانیت کو سربلند کرے گا اور زمین کو عدل و انصاف سے بھر دے گا۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ ایسا ہی ہوا اور سیدہ حضرت آمنہ کا یہ کشف لفظ بلفظ پورا ہوا۔ سرور کائنات، فخر موجودات، احمد مجتبیٰ، محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انسانیت کے نجات دہندہ کی حیثیت سے ظاہر ہوئے۔ آپؐ کی مقدس تعلیم، آپؐ کے اوصاف حمیدہ اور آپؐ کے پاکیزہ تر کردار نے مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک ساری دنیا میں ایک ایسا روحانی، اخلاقی، معاشی اور سماجی و سیاسی انقلاب برپا کر دیا کہ جس کی نظیر چشم فلک نے کبھی نہیں دیکھی تھی اور نہ آئندہ کبھی دیکھ سکے گی۔

حضرت سیدہ آمنہ کو حضورؐ کا نام رکھنے کی ہدایت

عام طور سے کہا جاتا ہے کہ حضورؐ اقدس کا اسم مبارک (محمدؐ) جناب عبدالمطلبؓ نے تجویز کیا تھا۔ مگر یہ درست نہیں۔ انہوں نے

اس نام کا اعلان ضرور کیا تھا مگر تجویز نہیں کیا تھا۔ چنانچہ سیدہ آمنہ خود فرماتی ہیں:-

"جس وقت مجھے حمل ہوا تو کسی (فرشتے) کی آواز آئی کہ تم ایسے شخص کی امانت دار بنی ہو جو (اپنی) امت کا سید (سردار) ہو گا۔ اس کی علامت یہ ہے کہ جب وہ پیدا ہو گا تو اس کے ساتھ ایسا نور نکلے گا جس سے شام میں بصریٰ کے محل روشن ہو جائیں گے۔ جس وقت یہ بچہ پیدا ہو تو اس کا نام محمد رکھنا" (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔ (۱۹)

گویا سیدہ آمنہ کو خدا تعالیٰ کی طرف سے صرف بیٹے کی بشارت ہی نہیں دی گئی بلکہ یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ یہ بیٹا بڑی شان والا ہو گا۔ خدا کا نبی و رسول ہو گا، سردار امت ہو گا، شام اور اس کے مضافات بھی اس کے قبضہ اقتدار میں ہوں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بیٹے کا نام بھی تجویز کر دیا گیا اور سیدہ آمنہ کو بتا دیا گیا کہ اس فرزند سعید و کبیر کا نام محمدؐ رکھنا۔ گویا حضور کا نام اللہ تعالیٰ نے تجویز فرمایا تھا جس طرح حضرت یحییٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور ان سے پہلے حضرت یعقوبؑ کے نام (اسرائیل) اللہ تعالیٰ ہی نے تجویز فرمائے تھے۔ پس سیدہ آمنہ نے جناب عبدالمطلبؓ کو اس نام کی اطلاع دی تھی اور انہوں نے خانہ کعبہ میں اس نام کا اعلان کیا تھا۔

جہاں تک جناب عبدالمطلبؓ والی روایت کا تعلق ہے کہ حضورؐ کا نام (محمدؐ) انہوں نے رکھا تھا تو اس کی حقیقت پر غور نہیں کیا گیا۔ ایک بہت بڑے مورخ اور حضورؐ اقدس کے مستند سیرت نگار نے لکھا ہے کہ:-

"حضرت عبدالمطلبؓ کے ایک بیٹے قثم نامی تھے جو نو سال کی عمر میں وفات پا گئے تھے۔ جب حضورؐ اقدس کی ولات ہوئی تو حضرت عبدالمطلبؓ نے جنہیں اپنے بیٹے کی وفات کا بہت دکھ ہوا تھا (اس کی یاد میں) حضورؐ کا نام قثم رکھ دیا۔ جب سیدہ آمنہ کو معلوم ہوا کہ ان کے نوزائیدہ فرزند کا نام "قثم" رکھا گیا ہے تو آپ نے حضرت عبدالمطلبؓ کو پیغام بھیجا کہ مجھے (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) حکم دیا گیا ہے کہ اس بچے کا نام محمدؐ رکھو۔ یہ سن کر حضرت عبدالمطلب نے حضور کا یہی نام رکھ دیا یعنی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔ (۲۰)

گویا اس روایت سے بھی تصدیق ہو گئی کہ حضورؐ اقدس کا اسم مبارک محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ نے تجویز فرمایا تھا، فرشتے کے ذریعے سے اس کی اطلاع پانے کی سعادت سیدہ آمنہ کو نصیب ہوتی اور اس نام کا اعلان کرنے کا شرف حضرت عبدالمطلبؒ کو حاصل ہوا۔

سیدہ آمنہ کی حضرت مریم سے مماثلت

عجیب اتفاق ہے بلکہ یہ اتفاق بھی نہیں صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس سارے معاملے میں تصرف الہیٰ کام کر رہا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے قبل آپ کی والدہ ماجدہ سیدہ مریم کے پاس بھی ایک فرشتہ آتا ہے اور آپ کو بشارت دیتا ہے کہ:-

"اے مریم! خوف نہ کر کیونکہ خدا کی طرف سے تجھ پر فضل ہوا ہے اور دیکھ تو حاملہ ہو گی اور تیرے بیٹا پیدا ہو گا۔ اس کا نام یسوع رکھنا وہ بزرگ ہو گا اور خداوند خدا اس کے باپ داودؑ کا تخت اسے دے گا" (۲۱)۔

دوسری طرف سیدہ آمنہ کو بھی عین عالم بیداری میں خبر دی گئی۔ روایت کے الفاظ ہیں "کسی نے خبر دی" ظاہر ہے کہ غیب کی خبر محلے والے یا ہمسائے تو نہیں دیا کرتے۔ یہ خبر فرشتے ہی نے دی تھی کہ (اے آمنہ!) آج کی رات تم جس حمل کی امانت دار بنی ہو یہ امت کا سردار ہو گا۔ اس کی ولادت کے وقت شام اور اس کے مضافات میں واقع محلات تمہیں دکھائے جائیں گے۔ ساتھ ہی فرشتے نے یہ بھی ہدایت کر دی کہ اس کا نام محمدؐ رکھنا۔ گویا سیدہ مریم کو بھی ایک بیٹے کی بشارت دی گئی اسے بھی بزرگ (سردار)

قرار دیا گیا۔ دوسری طرف سیدہ آمنہ کو بھی بتایا گیا کہ تم حاملہ ہو گئی ہو اور تمہیں ایک ایسا بیٹا دیا جائے گا جو اپنی امت کا سردار ہو گا۔ سیدہ مریم کو بھی ان کے بطن سے پیدا ہونے والے بیٹے کا نام بتا دیا گیا کہ یسوع رکھنا۔ ادھر حضرت آمنہ کو بھی ان کے بطن سے ہونے والے بیٹے کا نام بتا دیا گیا کہ محمدؐ رکھنا۔ سیدہ مریم کو بھی بشارت دی گئی کہ تمہارے بطن سے جو بیٹا پیدا ہو گا اس کے ذریعے سے حضرت داؤدؑ کی بادشاہت قائم کی جائے گی اور دوسری طرف سیدہ آمنہ کو بھی بشارت دی گئی کہ شام اور اس کے مضافات یعنی عراق اور ایران تک کے محلات ان کے عالی مرتبت فرزند گرامی (حضورؐ اقدس) کے غلاموں کے قبضے میں آ جائیں گے۔ کیا دونوں ماؤں کو دی جانے والی بشارتیں من و عن پوری نہیں ہو گئیں؟ یہ درست ہے کہ جناب مسیحؑ خود تو حضرت داؤدؑ کی ظاہری بادشاہی قائم نہیں کر سکے مگر آپؑ کے بعد آپؑ کے نام لیواؤں نے اس پیشگوئی کو پورا کر دیا اور ایک دنیا پر حضرت مسیحؑ کی عظمت کا علم لہرا دیا۔ اسی طرح حضورؐ اقدس کے زمانے میں اور آپؐ کے ذریعے براہ راست شام و عراق پر اسلامی حکومت قائم نہ ہو سکی مگر حضورؐ اقدس کے بعد آپ کے غلاموں نے قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کو پامال کر کے ان کے محلات پر اسلام کا علم لہرا دیا اس طرح حضورؐ اقدس کا یہ ارشاد پورا ہو گیا کہ:-

"میں اپنی ماں کا وہ رویا (کشف) ہوں جو انہوں نے نیند کی حالت میں نہیں بلکہ اپنی ظاہری آنکھوں سے دیکھا تھا اور پیغمبروں کی ماؤں کو اسی طرح دکھایا جاتا ہے"۔ (۲۲)

کتنا بڑا شرف تھا جو سیدہ آمنہ کو نصیب ہوا۔ کیا دنیا کی تاریخ میں کوئی خاتون ہے جو اس شرف میں سیدہ آمنہ کی شریک ہو؟ کیا حضورؐ اقدس سے بڑی ہستی اور آپؐ سے زیادہ عظیم پیغمبر کو کسی ماں نے جنم دیا؟

سیدہ آمنہ کی حضورؐ کے لئے دعا

شرفائے قریش کا دستور تھا کہ اپنے بچوں کو پیدا ہونے کے بعد جتنی جلد ممکن ہوتا تھا ان بدوی قبائل میں بھیج دیتے تھے جو صحراؤں میں آباد تھے تاکہ کھلی اور صحت بخش فضا میں بچوں کی اچھی طرح نشوونما ہو سکے اور وہ فصاحت زبان اور عربوں کی وہ خصوصیات ان میں پیدا ہو سکیں جو بدوی قبائل سے خاص تھیں کیونکہ شہروں میں مختلف اقوام کے لوگوں کی آمد و رفت رہنے کی وجہ سے وہاں کے باشندوں کی زبان بھی متاثر ہوتی تھی اور عادات و اطوار بھی مگر بدوی لوگ چونکہ شہروں سے دور اور شہری آبادی سے الگ تھلگ رہتے تھے اس لئے ان میں عربوں کی مخصوص فصاحت و بلاغت، صحت زبان اور عرب روایات پوری طرح محفوظ اور اپنی اصل حالت میں موجود رہتی تھیں۔ اس مقصد کے لئے بدوی عورتیں جو اپنے حسب نسب کے اعتبار سے نہایت شریف ہوتی تھیں شہروں میں آتیں اور نوزائیدہ بچوں کو اپنے ہمراہ لے جاتی تھیں، انہیں دودھ پلاتیں اور ان کی پرورش کرتی تھیں۔ اس طرح انہیں اس خدمت کا معقول معاوضہ مل جاتا تھا۔

جس سال حضورؐ اقدس پیدا ہوئے اس سال بھی معمول کے مطابق صحرائی قبائل کی دس شریف عورتیں مکہ آئیں اور نوزائیدہ بچوں کو اپنے ہمراہ لے گئیں۔ ان میں سے ایک محترم خاتون حلیمہؓ تھیں جو قبیلہ بنو سعد بن بکر سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہ بڑا ہی معزز اور بہادر قبیلہ تھا اور خود حلیمہؓ نہایت نجیب الطرفین اور شریف خاتون تھیں۔ انہیں حضورؐ اقدس کو اپنے ساتھ لے جانا، آپؐ کو دودھ پلانے اور آپؐ کی پرورش کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ روایات کے مطابق سیدہ آمنہ نے حضورؐ کو ایک ماہ دودھ پلایا تھا کہ حلیمہؓ آ گئیں اور حضورؐ اقدس کو اپنی گود میں لے لیا۔ (X) جب حضرت حلیمہؓ آپؐ کو لے کر جانے لگیں تو سیدہ آمنہ نے حلیمہؓ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ "اے دایہ اس بچے کی طرف سے مطمئن رہو کہ اس کی بڑی شان ہو گی۔" جب حلیمہؓ حضورؐ کو لے کر جانے لگیں تو

سیدہ آمنہ نے آپؐ کے لئے ان الفاظ میں دعا کی:-

اعیذ باللہ ذی الجلال من شرما مر علی الجبال حتی اراہ حامل الحلال و یقبل العرف الی الموال وغیرہ ھم من حشوۃ الرجال (۲۳)

(ترجمہ) "میں اپنے بچے کو خدائے ذوالجلال کی پناہ میں دیتی ہوں، اس شر سے جو پہاڑوں میں پلتا ہے یہاں تک کہ میں اسے اونٹ پر سوار دیکھوں اور دیکھ لوں کہ وہ غلاموں اور درماندہ لوگوں کے ساتھ نیک سلوک اور احسان کرنے والا ہے۔"

سیدہ آمنہ کا سفر آخرت

حضورؐ اقدس سیدہ آمنہ سے دور دو سال تک صحرا کی کھلی آب و ہوا میں پرورش پاتے رہے۔ دو سال گذر جانے کے بعد حلیمہؓ سعدیہ آپؐ کو واپس لے آئیں مگر ایک روایت کے مطاب ان دنوں مکہ میں کوئی وبا پھیلی ہوئی تھی اس لئے سیدہ آمنہ نے حضورؐ کو پھر حلیمہؓ سعدیہ کے ساتھ واپس بھیج دیا۔ دو سال آپؐ پھر صحرا میں رہے اور جب حضورؐ کی عمر چار سال کی ہو گئی تو حلیمہ سعدیہؓ حضرت آمنہ کی امانت آپ کے سپرد کر گئیں اس کے بعد حضورؐ اپنی والدہ ماجدہ کے زیر سایہ پرورش پاتے رہے یہاں تک کہ حضورؐ کی عمر مبارک چھ سال تین ماہ کی ہو گئی۔ اسی اثنا میں سیدہ آمنہ کو سفر یثرب (مدینہ) پیش آیا۔ آپ ہر سال اپنے شوہر حضرت عبداللہؒ کی قبر کی زیارت کے لئے جایا کرتی تھیں چنانچہ اسی معمول کے مطابق آپ ایک تجارتی قافلے کے ساتھ مدینہ روانہ ہو گئیں۔ اس وقت آپ پوری طرح صحت مند تھیں۔ تجارتی قافلے کے ساتھ یہ ایک اور مختصر سا قافلہ "الحادی" نامی رہبر کی رہنمائی میں روانہ ہوا۔ یہ قافلہ دو اونٹوں، ایک رہبر، سیدہ آمنہ، حضورؐ انور اور خادمہ حضرت ام ایمنؓ پر مشتمل تھا۔ مدینہ پہنچ کر سیدہ آمنہ اس مکان میں اتر گئیں جو حضرت عبداللہؒ کے ننھیال (X) کا مکان تھا اور جس میں حضرت عبداللہؒ کی قبر تھی۔ سیدہ آمنہ یہاں قریباً ایک ماہ مقیم رہیں اور پھر حضورؐ اقدس اور خادمہ ام ایمنؓ کو ساتھ لے کر واپس مکہ روانہ ہو گئیں۔ ابھی قافلہ مدینہ اور مکہ کے درمیان ہی میں تھا کہ اچانک بیمار ہو گئیں۔ کمزوری روز بروز بڑھتی گئی حتیٰ کہ درد سر نے اتنی شدت اختیار کی کہ آپ کے سر کو "صوف" نامی کپڑے سے باندھنا پڑا۔ بخار سخت تھا اور اتنا سخت کہ کچھ دیر کے لئے غشی طاری ہو گئی۔ چونکہ آخری وقت آ چکا تھا اس لئے کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوئی اور چند روز بیمار رہ کر دنیا کی یہ سب سے عظیم خاتون جس نے دنیا کی سب سے بڑی ہستی کو جنم دیا تھا اپنے رب کے پاس چلی گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ایک روایت کے مطابق آپ نے ۲۵ سال کے قریب عمر پائی۔ آپ کی وفات جولائی ۵۷۱ء میں ہوئی۔ بعض روایتوں میں عمر تیس سال بھی بیان کی گئی ہے۔

سیدہ آمنہ کا مقام وفات

سیدہ آمنہ نے جس مقام پر وفات پائی اس کا نام "الابوا" ہے اور اسے تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ شہرہ آفاق مورخ یاقوت حموی نے "ابوا" کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "کسی زمانے میں اس مقام پر کوئی وبائی مرض پھیلا تھا اس لئے اس شہر کا نام "ابوا" مشہور ہو گیا۔ دوسری روایت کے مطابق مشہور عرب شاعر "کثیر" سے جب ابوا کی وجہ تسمیہ کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے بتایا کہ چونکہ یہاں قافلے پڑاؤ کیا کرتے تھے اس لئے اس کا نام ابوا پڑ گیا کیونکہ "ابوا" کے معنی ٹھہرنے اور قیام کرنے کے ہیں۔ یاقوت حموی اس مقام کا تعین کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ مقام مدینہ سے مکہ کو جاتے ہوئے راستے میں آتا ہے اور "جحفہ" سے اس کا فاصلہ ۲۳ میل ہے یہ ایک خشک پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔ (۲۴)

ہمارے عہد کے ایک مصنف نے "ابوا" اور اس کے مضافات

کا خود دورہ کر کے جو کوائف درج کئے ہیں ان کے مطابق "ابوا" کا علاقہ ۱۲ کلو میٹر طویل اور ۳ کلو میٹر عریض (چوڑا) ہے۔ بعض جگہوں سے کشادہ اور بعض جگہوں سے تنگ ہے۔ شمال کی جانب سے اسے پہاڑ نے گھیر رکھا ہے اور جنوب کی سمت سیاہ ٹیلے اسے گھیرے ہوتے ہیں جن کی لمبائی قریباً پانچ سو میٹر ہے۔ اس کے اوپر ایک بہت بڑا حوض ہے (غالباً تالاب مراد ہے۔ مولف) جس میں بارش کا پانی جمع ہو جاتا ہے۔ زراعت اور باغبانی کے لئے اگر بارش کا پانی کافی نہ ہو تو پھر ٹیوب ویل کے ذریعے آب پاشی کی جاتی ہے۔ اس مقصد کے لئے ۱۵۰ ٹیوب ویل لگے ہوتے ہیں۔ ابوا میں کھجور، باجرہ، جوار، ٹماٹر، بیگن، گھیا کدو (لوکی) میٹھا کدو، تربوز اور خربوزے وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔ گائیں، بکریاں اور مرغیاں بکثرت ہیں۔ لوگ باز کے ذریعے پرندوں کا شکار کرتے ہیں۔

"ابوا" کی آبادی پانچ ہزار نفوس پر مشتمل ہے لوگوں کی گذر اوقات کھیتی باڑی اور مویشی پالنے پر ہے۔

ابوا میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ کی طرف ایک چھوٹی سی پہاڑی پر سیدہ آمنہ کی قبر ہے جو دور سے نظر آ جاتی ہے کیونکہ اس کے چاروں طرف ایک میٹر یعنی قریباً تین فٹ بلند پتھر رکھے ہوتے ہیں۔ پہاڑ کے اوپر اور نیچے (یا) اس کے قرب و جوار میں کوئی دوسری قبر نہیں ہے۔ (۲۵)

(۱۸) ،،مواہب الدینہ،،۔ ص ۲۱۔ مولفہ علامہ القسطلانیؒ و خصائص الکبری،، ۳۷۔ مولفہ امام جلال الدین سیوطیؒ۔

(۱۹) خصائص الکبری۔ ص ۳۶ (علامہ جلال الدین سیوطی) و سیرت ابن اسحاق۔

(۲۰) السیرۃ الحلبیہ۔ جلد اول۔ ص ۷۶

(۲۱) لوقا کی انجیل باب ۱۔ آیت ۳۰ تا ۳۲

(۲۲) ،،مواہب الدینہ،،۔ ص ۲۲ (علامہ القسطلانیؒ)

(X) ایک روایت کے مطابق ابو لہب کی آزاد کردہ کنیز جناب ثویبہؓ کو بھی چند روز حضورؐ کو دودھ پلانے کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ و اللہ اعلم (مولف)

(۲۳) رحمتہ للعالمین جلد دوم۔ ص ۱۰۳ مولفہ سید سلمان منصور پوری۔

(X) حضرت عبداللہؓ کے دادا جناب ہاشمؒ کی بیوی سلمیٰ بنت عمرو مدینہ کی رہنے والی تھیں (مولف)

(۲۴) ،،معجم البلدان،،۔ جلد اول۔ ص ۷۹۔ مولفہ یاقوت حموی (ایڈیشن ۱۹۵۵ء) بیروت۔ دار صادر۔

(۲۵) تاریخ مکہ المکرمہ جلد اول۔ ص ۲۱۸، ۲۱۹۔ مولفہ محمد عبدالمعبود۔ (مطبوعہ راولپنڈی پاکستان)

(ماخوذ از "ام رسول صلعم" مصنفہ پیام شاہجہانپوری، شائع کردہ ادارہ تاریخ و تحقیق، این۔ ۲۳، عوامی فلیٹس، ریواز گارڈن، لاہور قیمت ۸۰ روپے ص ص ۶۹ تا ۸۰)

تبصرہ

قسط ۶

تبصرہ: "قادیانی مسئلہ اور لاہور گروپ کی حیثیت"

وفات مسیح ابن مریم کا اعلان اور مخالفت کی ابتدا

میں نے اوپر لکھا ہے کہ حضرت مرزا صاحب نے ۱۸۸۵ء کے شروع میں بحکم خدا خواہش مند احباب و خواتین سے بیعت لینے کا آغاز لدھیانہ شہر سے کیا۔ اس بیعت سے اللہ تعالیٰ نے اپ کو صالحین کی ایک بڑی مضبوط، فعال اور راہ خدا میں اپنا تن من دھن قربان کرنے والی جماعت عطا کر دی۔ جس میں حیرت انگیز طور پر روز افزوں اضافہ ہوا چلا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے جماعت ہزاروں تک جا پہنچی۔ ایسے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو یکایک ۱۸۹۰ء میں الہام ہوا۔ "مسیح ابن مریم فوت ہو گیا و جعلناک المسیح ابن مریم۔" اس الہام سے آپ پر منکشف ہو گیا کہ مسیح ابن مریم آسمان سے دوبارہ آنیوالا نہیں بلکہ وہ تو فوت ہو چکا ہے اور جس نے دراصل امت محمدیہ میں آنا تھا وہ آپ خود ہیں۔ آپ نے اس الہام الٰہی کو سب سے پہلے قرآن شریف پر پیش کیا تو آپ نے قرآن حکیم کو اس کا موید پایا اور آپ کو علم بخشا گیا کہ قرآن شریف تو حضرت عیسٰے علیہ السلام کی موت کی صریحاً خبر دیتا ہے اور اس کی تیس آیات واضح طور پر مسیحؑ کی وفات پر دلالت کرتی ہیں اور جب آپ کا دل اس علم ربانی اور معرفت سے پوری طرح مطمئن ہو گیا تو آپ نے ایک مرد حق اور مومن صادق کی طرح بلا خوف لومتہ و لائم دنیا میں اعلان کر دیا کہ مسیح ابن مریم از روئے قرآن اپنی طبعی عمر دنیا میں گذار کر وفات پا چکے ہیں اور جس مسیح کا وعدہ امت محمدیہ کے لیئے ختمی المرتبت حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے وہ یہ عاجز ہے۔ آپ کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ اس اعلان سے پورے برصغیر ہند کے طول و عرض میں ایک کہرام مچ جائیگا اور آپ کے خلاف ایک طوفان بپا ہو جاتے گا اور علماء کا سارا گروہ جو آپ کا ثنا خوان تھا وہ بیک زبان آپ کے خلاف اٹھ کھڑا ہو گا اور آپ کے در پے آزار ہو جائے گا اور مخلوق خدا کو آپ کے بارے میں بدظن اور بدگمان کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کریگا۔ کیونکہ ابتدائے آفرینش سے باطل کی حق کے ساتھ یہی روش چلی آ رہی ہے۔ مگر چونکہ آپ کوئی دنیا دار نہ تھے اور اغراض دنیوی کی کوئی حرص و آرزو نہیں رکھتے تھے اور خدا تعالیٰ کی خالص خوشنودی کے لیئے اس عزت اور قدر و منزلت کو قربان کرنے کے لیئے ہر وقت تیار تھے جو دنیا کے لوگوں کی عطا کردہ تھی۔ اسلیئے پورے انشراح صدر کے ساتھ وادی خار زار میں قدم رکھ دیا اور علامہ اقبال کے اس شعر کی عملی تفسیر بن گئے۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اس اعلان سے آپ نے اپنے لیئے دو نہایت ہی خوفناک دشمن پیدا کر لیئے۔ اول خود مسلمان اور علماء دین۔ دوم عیسائی دنیا جو بے پناہ وسائل کی مالک تھی۔ مسلمانوں نے تو محض اپنے پرانے عقیدہ پر زد پڑنے کے باعث شور و غوغا بلند کرنا شروع کر دیا مگر وفات مسیح ابن مریم کی جو زد عیسائی مذہب پر پڑی اس سے اس کے ہوش و حواس اڑ گئے کیونکہ اگر مسیح کی طبعی موت ثابت ہو جاتے تو عیسائی مذہب بیخ و بن سے ہی اکھڑ جاتا ہے اور اسے زندہ رہنے کے لیئے باقی کچھ نہیں

رہتا۔ بہر حال آپ نے وفات مسیح پر از روئے قرآن و احادیث بڑے مدلل و مسکت ثبوت اپنی کتاب "ازالہ اوہام" میں دیے اور علماء کرام کو ادب و احترام کے ساتھ دعوت غور و فکر دی۔ مگر بد قسمتی سے وہ اعتقادی لحاظ سے لکیر کے فقیر ہو چکے ہوئے تھے۔ وہ حیات مسیح کے خلاف کچھ سننے کے لیئے تیار نہ تھے۔ انہوں نے نہ قرآنی آیات کی پرواہ کی نہ فرمودات رسول صلعم کی۔ ایک بے ہنگم سا جوش و خروش پیدا کر لیا اور مخالفت میں آسمان سر پر اٹھالیا۔ حضرت مرزا صاحب نے تمام نامی گرامی علماء کو حیات و وفات مسیح پر دعوت مناظرہ دی۔ تو کسی نے سامنے آنے کی جرات بھی نہ کی البتہ اہل حدیث کے جید عالم مولوی محمد حسین بٹالوی نے عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے۔ مناظرہ کی حامی بھر لی اور لدھیانہ کے مقام پر باہم مناظرہ ہوا۔ جو مباحثہ "الحق لدھیانہ" کے نام سے مشہور ہے اور طبع شدہ موجود ہے۔ مولوی محمد حسین نے اصل موضوع پر کہ آیا حضرت مسیح ابن مریم ابھی تک آسمان پر بجسد عنصری باحیات ہیں یا وفات پا چکے ہیں ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالا اور سارا وقت احادیث کی دین اسلام میں حیثیت کے بارے میں بے معنی گفتگو میں ضائع کر دیا۔ بہر حال اس گفتگو سے اتنا فائدہ ضرور پہنچا کہ حدیث کے بارے میں بھی حضرت مرزا صاحب کے تبحر علم کا علما پر سکہ جم گیا۔ پنجاب سے باہر ہندوستان کے باقی علما بھی اس موضوع پر گفتگو سے گریز پائی اختیار کر گئے صرف ایک مولوی محمد بشیر بھوپالوی کے دل میں تحریری مناظرہ کا ابال اٹھا۔ دوسرے علمانے ان سے حیات مسیح کے بارے میں دلائل پوچھے تو انہوں نے ان کے سامنے قرآنی آیت **و ان من اهل الكتاب الا ليومنن به من قبل موته** پیش کر دی۔ اس پر علماء نے مشورہ دیا کہ بہتر یہ ہے کہ آپ مناظرہ سے کنارہ کش ہو جائیں کیونکہ اس آیت قرآنی سے حیات مسیح آپ ہرگز ثابت نہ کر سکیں گے۔ مگر وہ مولوی صاحب مناظرہ پر مصر رہے جس پر تمام علماء ان سے علیحدہ ہو گئے اور ہر قسم کے تعاون سے معذرت کر دی۔ بایں ہمہ مناظرہ اپنے مقررہ اوقات میں منعقد ہوا۔ یہ تحریری مناظرہ "مباحثہ الحق دہلی" کے نام سے مشہور ہوا کیونکہ دہلی کے مقام پر ہوا تھا اور شائع شدہ موجود ہے۔ جو شخص بھی اس کا مطالعہ کرے گا وہ خود ہی محسوس کرلے گا کہ مولوی محمد بشیر بھوپالوی نے اس مباحثہ میں منہ کی کھائی ہے۔ ان دو مناظرں کے علاوہ حضرت مرزا صاحب کی زندگی میں کسی عالم کو اس موضوع پر آپ سے گفتگو کی کبھی جرات نہ ہوئی اور یہ عجیب بات ہے کہ ہر مخالف حضرت مرزا صاحب پر یہ الزام لگاتا پھرتا ہے کہ آپ نے مسیح موعود ہونے کا جھوٹا دعویٰ کیا۔ مگر کوئی عالم حیات مسیح پر قلم اٹھانے کی جرات نہیں کرتا۔

ڈاکٹر ایم اے غازی کو عالم دین ہونے کا بڑا گھمنڈ ہے۔ وہ کیوں میدان میں نہیں اترتے اور از روئے قرآن و احادیث حیات مسیح ابن مریم ثابت نہیں کرتے۔ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام واقعی آسمان پر بجسد عنصری زندہ موجود ہیں۔ تو پھر حضرت مرزا صاحب کا دعویٰ خود بخود باطل ہو جاتا ہے۔ اگر آپ لوگ حضرت مسیح ؑ کو زندہ ثابت نہیں کر سکتے اور یقیناً آپ ہرگز ثابت نہیں کر سکتے اور چونکہ آپ کے مقابلے میں حضرت مرزا صاحب نے بتوفیق الہیٰ قرآن شریف اور احادیث نبویؐ سے ان کا فوت شدہ ہونا ثابت کر دیا ہوا ہے۔ اس لئے آپ کے پاس انہیں بحثیت مسیح موعود جھٹلانے کیلئے کوئی دلیل نہیں رہتی۔ اصولی بات یہ ہے کہ علماء مخالف اگر اپنے موقف اور عقیدہ میں سچے ہیں۔ تو سب سے پہلے حیات مسیح ثابت کریں اور اگر وہ از روئے قرآن و حدیث حضرت مسیح ابن مریم کو زندہ ثابت نہ کر سکیں تو پھر لازماً حضرت مرزا صاحب کی یہ ان پر بہت بڑی فتح ہے اور ان کے صادق ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسیح ابن مریم کی موت ثابت ہو جانے سے مسلمانوں کے ایمان پر کوئی مضر اثر نہیں پڑتا بلکہ اس سے تو آیہ خاتم النبیین کی اصل حقیقت اکمل اور اتم طور پر ثابت ہو جاتی ہے۔ لیکن مسیح کی موت سے عیسائی

مذہب کا باقی کچھ نہیں رہتا اس کی عالیشان عمارت اس ایک جھٹکے سے زمیں بوس ہو جاتی ہے اور مسیح محمدی کا آنا تو خود حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امامکم منکم فرما کر پہلے ہی بتا دیا ہوا ہے کہ وہ آنحضرت صلعم کی امت کا ایک فرد ہیں۔ اس سے اسرائیلی نبی مراد نہیں۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ خدا تعالیٰ تو امت محمدیہ کو کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر قرار دے اور ہمارے علماء اسے ایک اسرائیلی نبی کی پیشوائی اور رہبری کا محتاج قرار دیں۔ یہ بڑا سطحی خیال ہے اور اس سے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسیہ پر حرف آتا ہے اور حدیث علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل کی تضحیک لازم آتی ہے۔

آج حضرت مرزا صاحب کی وفات کو چھیاسی برس گذر گئے ہیں۔ ہمارے آقا و مولا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آنیوالے مسیح کے جو کام بتاتے تھے یعنی یکسر الصلیب اور یقتل الخنزیر یہ دونوں کارنامے حضرت ممدوح نے اس شان سے سر انجام دیے کہ تمام اہل حق علماء و فضلا اور مشاہیر اسلام نے اور خود اسلام کے دشمنوں نے بھی تسلیم کر لیا اور اس محیر العقول کامیابی پر انہیں سنہری حروف میں خراج تحسین پیش کیا۔ اب بتاؤ اس کے صادق ہونے میں کیا کسر باقی رہ جاتی ہے۔ جناب ایم اے غازی کو حضرت مرزا صاحب کی کامیابیاں دکھائی نہیں دیتیں انہیں صرف ان کے وجود میں انگریز کا ایک ایجنٹ دکھائی دیتا ہے۔ مگر دوسری جانب انگریز کو وہی شخص اپنا خطرناک ترین دشمن نظر آتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس پر آشوب زمانہ میں عیسائیوں کے دانت کھٹے کرنیوالا سوائے حضرت مرزا صاحب کے اور کون تھا۔ میں کہتا ہوں سارا عالم اسلام پھر جاؤ۔ دنیا کا کونا کونا چھان مارو تمہیں صرف ایک حضرت مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کی جماعت نظر آئے گی جس نے تمام دنیا کے مخالف اسلام دشمنوں کا نہ صرف ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ بلکہ ان کے اسلحہ خانوں پر جا کر دلائل و براہین کی وہ گولہ باری کی کہ وہ اسلحہ خانے بھی دھواں بن کر ہوا میں اڑ گئے۔ اسلام پر جو مصائب و شدائد کے پہاڑ ٹوٹے ہوئے تھے۔ غازی صاحب کی نگاہ ان کی طرف نہیں اٹھتی اور قیامت اس بات پر ڈھاتے ہیں کہ یہ دیکھو مرزا نے نبوت کا دعویٰ کر کے مسلمانوں کے عقیدہ ختم نبوت پر کاری چوٹ لگائی ہے اور یہی عقیدہ مسلمانوں کے مضبوط اتحاد اور یکجہتی کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اس شخص نے یہ دعویٰ کر کے اتحاد ملی کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ بزرگوار اس دن سے اتحاد ملی کی اس بنیاد کو بیخ و بن سے اکھاڑ چکے ہیں جس دن مسیح ابن مریم کے دوبارہ دنیا میں آنے کا غیر اسلامی عقیدہ مسلمانوں نے اختیار کر لیا تھا۔ کیونکہ اگر فی الواقع حضرت مسیح ابن مریم جو رسول الی بنی اسرائیل تھے دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں تو لازماً ان کی نبوت و رسالت بھی ان کے ساتھ ہو گی اور وحی نبوت بواسطہ حضرت جبرائیل کا بھی دوبارہ اجرا تسلیم کرنا پڑے گا اور یہ دونوں امور ختم نبوت کے نقیض ہیں اور اس طرح بجائے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ خاتم النبیین قرار پا جائینگے۔

حضرت مرزا صاحب نے مسیح موعود کے دعویٰ کے بعد تین کتابیں "فتح اسلام"، "توضیح مرام" اور "ازالہ اوہام" حصہ اول و دوم شائع فرمائیں۔ وفات مسیح پر ازروئے قرآن اور احادیث دلائل ساطعہ دیے اور حقیقت دجال پر سیر حاصل بحث فرمائی۔ ازالہ اوہام حصہ دوم کے صفحہ ۵۱۸،۱۹ پر ابن ماجہ اور حاکم میں بیان کردہ حدیث نبوی لا مھدی الا عیسیٰ کے تحت امام مہدی ہونے کا دعویٰ بھی فرمایا اور ان تصنیفات میں مجدد و محدث کے مقام و منصب پر بھی روشنی ڈالی۔ اگرچہ آپ کا اصل دعویٰ محدثیت کا تھا۔ تاہم آپ نے محدثیت کو جزوی، طفیلی، ظلی اور بروزی طور پر نبوت بھی قرار دیا۔ علما چونکہ حضرت مسیح ابن مریم کی وفات کے بارے میں حضرت مرزا صاحب کے اعلان سے مخالفت پر کمربستہ ہو چکے تھے۔ اس لیئے انہوں نے آپ کی تشریحات کو قبول نہ کیا اور آپ کے خلاف ایک

فتویٰ کفر تیار کر کے شائع کر دیا جس کا ایک اقتباس مندرجہ ذیل ہے :

"اس الزام کے جواب میں شاید قادیانی یا اس کے حواری یہ دو عذر پیش کریں۔ اول یہ کہ ہرچند قادیانی نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اس نبوت کا دوسرا نام محدثیت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نبوت کے دعویٰ سے محدثیت کا دعویٰ مراد ہے نہ حقیقتاً اور معناً نبی ہونے کا دعوی۔۔۔ جواب یہ ہے کہ اگرچہ قادیانی نے یہ بات کہہ دی ہے کہ جس نبوت کا اس کو دعویٰ ہے اور اس کا دروازہ قیامت تک کھلا رہے گا اس کا دوسرا نام محدثیت ہے اور اسی محدثیت کے معنے سے نبوت کا وہ مدعی ہے مگر ساتھ اس کے اس نے محدثیت کے معنے ایسے بیان کیئے ہیں اور اس کی حقیقت کی ایسی تشریح کر دی ہے کہ اس سے بجز نبوت اور کچھ مراد نہیں ہو سکتا"

(فتویٰ کفر ص ۶-۷)

حضرت مرزا صاحب نے مکفر علماء کے الزام کی تردید میں اپنی کتاب "حمامتہ البشریٰ" میں جو عربی زبان میں لکھی گئی۔ ایک جگہ تحریر فرمایا۔ اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"اور میں نے اپنی بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ تحدیث کا مقام مقام نبوت سے شدید مشابہت رکھتا ہے اور سوائے قوت اور فعل کے ان میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن ان لوگوں نے میرے قول کو نہیں سمجھا بلکہ یہی کہا کہ یہ شخص نبوت کا مدعی ہے اور اللہ جانتا ہے کہ ان کا قول صریح کذب ہے اور اس میں ذرہ بھی سچائی کی چاشنی نہیں اور نہ اس کا کوئی اصل ہے اور اس کو انہوں نے صرف اس لیئے تراشا ہے کہ لوگوں کو تکفیر اور گالی اور لعن طعن پر اکسائیں اور انہیں فساد اور عناد کے لیئے اٹھائیں اور مومنوں میں تفریق کریں اور بخدا میں اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان رکھتا ہوں اور اس پر بھی میرا ایمان ہے کہ رسول اللہ خاتم النبیین ہیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ میں نے یہ کہا ہے کہ محدث میں تمام اجزائے نبوت پائے جاتے ہیں لیکن بالقوۃ نہ بالفعل۔ پس محدث بالقوۃ نبی ہے اور اگر نبوت کا دروازہ بند نہ ہوتا تو وہ بھی بالفعل نبی ہوتا۔۔۔ اور کمالات نبوت سب کے سب تحدیث میں مخفی اور مضمر ہوتے ہیں اور ان کا ظہور اور خروج فعل تک صرف اس لیئے رک جاتا ہے کہ باب نبوت مسدود ہے اور اسی کی طرف نبیؐ نے اپنے قول میں اشارہ کیا ہے کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ ہوتا اور یہ صرف اسی نے کہا کہ حضرت عمرؓ محدث تھے پس یہ اشارہ کیا کہ نبوت کا مادہ اور اس کا تخم محدث میں موجود ہوتا ہے"۔ (حمامتہ البشریٰ ص ۸۱، ۸۲)۔

حضرت مرزا صاحب نے محدث کی جو تعریف اپنی کتابوں میں شائع فرمائی خدا جانے علماء مخالف نے اس تعریف کو دعویٰ نبوت پر کیوں محمول کیا۔ بہر حال ان کے فتویٰ کفر کے بعد حضرت اقدس اور مولوی عبدالحکیم صاحب کے مابین لاہور میں ایک مباحثہ ہوا جو مسئلہ دعویٰ نبوت مندرجہ کتاب حضرت مرزا صاحب کے بارے میں تھا۔ اس کی تفصیل حسب ذیل تھی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جو مباحثہ لاہور میں مولوی عبدالحکیم صاحب اور مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے درمیان چند روز سے بابت مسئلہ دعویٰ نبوت مندرجہ کتب مرزا صاحب کے ہو رہا تھا آج مولوی صاحب کی طرف سے تیسرا پرچہ جواب الجواب کے جواب میں لکھا جا رہا تھا۔ اثنائے تحریر میں مرزا صاحب کی عبارت مندرجہ ذیل کے بیان کرنے پر جلسہ عام میں فیصلہ ہو گیا۔ وہ عبارت درج ذیل ہے۔ المرقوم ۳ فروری ۱۸۹۲ء مطابق ۳ رجب ۱۳۰۹ھ۔

العبد:- برکت علی وکیل چیف کورٹ، العبد:- محی الدین المعروف صوفی، العبد:- خاکسار رحیم بخش، العبد:- فضل دین، العبد:- رحیم اللہ، العبد:- حبیب اللہ، العبد:- ابو یوسف محمد مبارک علی

الحمدللہ والصلوۃ والسلام علیٰ رسولہ خاتم النبیین اما بعد

تمام مسلمانوں کی خدمت میں گزارش ہے کہ اس عاجز کے رسالہ "فتح اسلام" و "توضیح مرام" و "ازالہ اوہام" میں جس قدر ایسے الفاظ موجود ہیں کہ محدث ایک معنی میں نبی ہوتا ہے یا یہ کہ محدثیت جزوی نبوت ہے یا یہ کہ محدثیت نبوت ناقصہ ہے۔ یہ تمام الفاظ حقیقی معنوں پر محمول نہیں ہیں بلکہ صرف سادگی سے ان کے لغوی معنوں کی رو سے بیان کئے گئے ہیں۔ ورنہ حاشا و کلا مجھے نبوت حقیقی کا ہرگز دعویٰ نہیں بلکہ جیسا کہ میں کتاب "ازالہ اوہام" کے صفحہ ۱۳۸ میں لکھ چکا ہوں میرا اس بات پر ایمان ہے کہ ہمارے سید و مولانا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں۔ سو میں تمام مسلمان بھائیوں کی خدمت میں واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اگر وہ ان الفاظ سے ناراض ہیں اور ان کے دلوں پر یہ الفاظ شاق ہیں تو وہ ان الفاظ کو ترمیم شدہ تصور فرما کر بجائے اس کے محدث کا لفظ میری طرف سے سمجھ لیں۔ کیونکہ کسی طرح مجھ کو مسلمانوں میں تفرقہ اور نفاق ڈالنا منظور نہیں۔ جس حالت میں ابتدا سے میری نیت میں جس کو اللہ جل شانہ خوب جانتا ہے اس لفظ نبی سے مراد حقیقی نبوت نہیں بلکہ صرف محدث مراد ہے۔۔۔ تو پھر مجھے اپنے تمام مسلمان بھائیوں کی دل جوئی کے لیئے اس لفظ کو دوسرے پیرایہ میں بیان کرنے سے کیا عذر ہو سکتا ہے۔ سو دوسرا پیرایہ یہ ہے کہ بجائے لفظ نبی کے محدث کا لفظ ہر جگہ سمجھ لیں اور اس کو کاٹا ہوا خیال فرمالیں (یعنی لفظ نبی کو)۔۔۔

راقم خاکسار مرزا غلام احمد قادیانی مولف رسالہ "توضیح المرام" "ازالہ اوہام" ۳ فروری ۱۸۹۲ء۔

محمدی پریس

حضرت مرزا صاحب کا یہ اعلان محمدی پریس میں چھپ کر عوام میں تقسیم کیا گیا اور تمام مکفر اور مخالف علماء کو بھی پہنچا۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے اپنے مخالفانہ رویہ میں کوئی تبدیلی نہ کی بلکہ مخالفت کی مہم کو اور بھی تیز کر دیا۔ مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ محدثیت کی جو تشریح حضرت مرزا صاحب نے اپنی کتب میں فرمائی تھی کیا وہ ان کی اپنی ایجاد کردہ تھی جس پر مکفر علما سیخ پا ہو رہے تھے یا یہی تشریح پہلے ہی امت میں مسلمہ چلی آ رہی تھی۔ علماء کو گزشتہ مجددین اور محدثین کے دعاوی اور اقوال خوب یاد تھے اور نبی کی اصل تعریف سے بھی اچھی طرح آگاہ تھے۔ انہوں نے محض ایک فتنہ جگانے کی خاطر الزام تراشی کا سلسلہ چلا رکھا تھا جو اب تک جاری و ساری ہے۔ دیانتداری کا تقاضہ تو یہ تھا کہ جب آپ نے مسلمان شاہدوں کے روبرو لکھ دیا تھا کہ میری کتابوں میں جہاں جہاں لفظ نبی کا آیا ہے اسے کاٹا ہوا تصور کر کے وہاں محدث کا لفظ سمجھ لیں تو مکفر علماء کی تسکین اور تشفی ہو جاتی اور وہ مخالفت سے دست بردار ہو کر مدافعت اور غلبہ اسلام کے فریضہ میں آپ کے حامی و ناصر اور ممد و معاون ہو جاتے۔ مگر چونکہ علماء سو نظیف مٹی کے نہیں بنے ہوتے تھے اسلیئے ان سے خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ کیا ان علماء اور آج کے محقق مولانا روم کے ان اشعار سے ناواقف تھے اور ہیں

چوں بدادی دست خود در دست پیر
بہر حکمت کو علم است و خبیر
او نبی وقت خویش است اے مرید
تا ازو نور نبی آید پدید
دست تو از اہل آں بیعت شود
کہ ید اللہ فوق ایدیہم بود
مکر کن در کار نیکو خدمتے
تا نبوت یابی اندر امتے

نہیں وہ ان اشعار سے خوب واقف تھے اور ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مکتوب بھی انہیں اچھی طرح معلوم ہے "الحمد للہ و سلام علے عبدہ الذین اصطفےٰ۔ میں اللہ تعالیٰ کا مرید بھی ہوں اور اس کا مراد بھی۔ میری ارادت کا سلسلہ بغیر کسی واسطہ کے اللہ سے متصل ہے اور میرا ہاتھ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ کا

قائمقام ہے۔ سبحانہ، پس میں محمد رسول اللہ صلعم کا مرید بھی ہوں اور اس کا پیر بھائی بھی ہوں۔ اس دولت کے دسترخوان پر اگرچہ میں ہرچند طفیلی ہوں مگر بغیر بلانے کے نہیں گیا اور ہرچند کہ میں تابع ہوں لیکن اصلیت سے بے بہرہ نہیں ہوں اور ہرچند کہ میں امتی ہوں لیکن میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شریک دولت بھی ہوں لیکن ایسا شریک نہیں کہ ہمسری کا دعویٰ کروں کیونکہ یہ کفر ہے"۔

(مکتوب نمبر ۸۷ از مکتوبات ربانی جلد سوم)۔

ایم اے غازی صاحب کی توجہ میں خاص طور پر حضرت مجدد صاحب کے مندرجہ ذیل مکتوب کی طرف مبذول کرانا ضروری سمجھتا ہوں:

"ایک تابعدار اپنے متبوع سے ایسے طور پر مشابہت پیدا کر لیتا ہے کہ تابعداری کا نام درمیان سے اٹھ جاتا ہے اور تابع اور متبوع کا فرق زائل ہو جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تابع اپنے نبی متبوع کے رنگ میں ہو کر جو کچھ حاصل کرتا ہے وہ اصل (خدا تعالیٰ) سے حاصل کرتا ہے گویا دونوں ایک ہی چشمہ سے پانی پیتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے ہیں اور دونوں ایک بستر میں ہیں اور دونوں آپس میں شیر و شکر ہیں۔ تابع کہاں اور متبوع کون اور تابع داری کس کی۔ اتحاد میں نسبت غیریت گنجائش نہیں رکھتی اور تابعداری اور متبوعیت کا فرق معلوم نہیں ہوتا۔"

____ (مکتوبات ربانی جلد دوئم مکتوب نمبر ۵۴)

کیوں جناب حضرت مجدد صاحب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بروز کامل ہوئے یا نہ؟ اگر حضرت مرزا صاحب نے خود کو آنحضرت کا بروز کامل کہہ دیا تو کون سا گناہ کیا۔

محمد رسول اللہ صلعم کے بروز تو ہر زمانہ میں ہوتے رہے ہیں۔ ان کے درمیان فرق صرف وہی ہے جو چاند کی مختلف اشکال میں پایا جاتا ہے۔ چاند کی کامل صورت چودھویں رات کو ہوتی ہے اور وہ بدر منیر کہلاتا ہے اور پہلی راتوں کے چاند سے بہر طور افضل ہوتا ہے اسی بروزی فضیلت کا دعویٰ حضرت مرزا صاحب کا ہے۔ ڈاکٹر غازی کے نزدیک بروزی نبوت اور حقیقی اور کامل نبوت میں کوئی فرق نہیں (ص ۲۸) اگر یہ بات سچ ہے تو حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ کے بارے میں ان کا کیا فتویٰ ہے؟ انہوں نے اپنے آپ کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شریک دولت بھی قرار دیا۔ پیر بھائی بھی قرار دیا اور تابع اور متبوع کے درمیان نسبت غیریت کا خاتمہ بھی کر دیا اور جس چشمہ سے نبی متبوع پانی پیتے تھے اسی چشمہ سے پانی پینے کا دعویٰ کیا۔ حضرت شبلی علیہ الرحمۃ کے ذکر میں آیا ہے:

"دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب شبلی علیہ الرحمۃ کی صورت میں ظاہر ہوتے تو شبلی نے اپنے شاگرد سے کہا کہ میں شہادت دیتا ہوں اس بات کی کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور شاگرد بھی صاحب کشف تھا۔ پس ان کو پہچان لیا اور کہا کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ تو اللہ کا رسول ہے (الانسان الکامل باب ۶۰)

اگر بروز سے مراد غازی کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خود دوبارہ جنم لینا ہے تو پھر تو آپ صلعم نے ہر مجدد و محدث اور ولی کامل میں بار بار جنم لیا ہے آپ صرف حضرت مرزا صاحب کی تخصیص کیوں کرتے ہیں۔ جن کا واضح فرمان یہ ہے۔

برتر گمان و وہم سے احمدؐ کی شان ہے
جس کا غلام دیکھو مسیح زمان ہے
اس نور پہ فدا ہوں اس کا ہی میں ہوا ہوں
وہ ہے میں چیز کیا ہوں بس فیصلہ یہی ہے

غازی صاحب نے تحفہ گولڑویہ کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ حضرت مرزا صاحب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کا بروز قرار دیا ہے اور غازی صاحب بار بار بروز سے دوبارہ جنم مراد لیتے ہیں جو بالبداہت غلط اور لغات عربی کے صریحاً خلاف ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت مرزا صاحب

نے یہ بات اس کتاب میں ضرور لکھی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ غازی صاحب نے تدبر و تفکر سے کام نہیں لیا۔ محمد رسول اللہ صلعم پہلے براہ راست نبی مبعوث ہوئے اور بعد میں ان دونوں نبیوں کے بروز ہوئے۔ آپ صلعم ان کا بروز ہونے کے سبب نبی نہیں بنے تھے اور بروز سے مراد صرف یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی ذات اور نبوت میں صرف جلال کا پہلو رکھتے تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف جمال کا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں صفات کے مظہر کامل تھے۔ مگر حضرت مرزا صاحب بروز محمدؐ ہونے کی وجہ سے نبی کہلاتے تھے۔

جہاں تک مرزا بشیر الدین محمود احمد جو قادیانی گروہ کے لیڈر اور خلیفہ تھے کی کتابوں سے حوالوں کا معاملہ ہے۔ ہم ان سے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہیں۔ کیوں کہ ہمیں ان کے اعتقاد اور مسلک سے شدید اختلاف ہے۔ البتہ ہم صرف حضرت مرزا صاحب کی تحریرات کے بارے میں تمام شکوک و شبہات اور اعتراضات کے تسلی بخش جوابات دینے کے ضرور مکلف ہیں اور اس مقصد کے لیئے ایک الگ باب اپنی کتاب میں وقف کریں گے۔ غازی صاحب نے بڑا تکلف کر کے ۱۸۸۸ء سے ۱۹۰۱ اور ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۸ تک از خود دو دور مقرر کر کے لکھا ہے کہ حضرت مرزا صاحب نے آخری دور میں حقیقی اور کامل نبوت کا دعویٰ کیا تھا جو سراسر غلط الزام ہے۔ آپ نے مجددیت، مسیحت اور امام مہدی کے جو دعاوی ابتدائی دور میں کیئے آپ تادم مرگ انہیں پر قائم و برقرار رہے اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہ کی تھی۔ یہ صرف مرزا بشیر الدین محمود احمد نے پہلی بار ۱۹۱۵ء میں اعلان کیا تھا کہ حضرت مرزا صاحب نے اپنے سہ ورقہ اشتہار "ایک غلطی کا ازالہ" میں اپنے سابقہ دعویٰ محدثیت میں اصلاح کر کے اصلی اور حقیقی نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ یہ اشتہار اکتوبر ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ اس رسالہ یا اشتہار کے شائع ہونے پر کسی مکفر علماء میں سے کسی ایک عالم نے بھی "ایک غلطی کے ازالہ" کے حوالہ سے نہ زبانی اور نہ تحریری طور پر اعلان کیا۔ کہ دیکھ لو لوگو جو بات ہم شروع سے کہتے چلے آرہے ہیں اور جس کی تردید یہ مرزا متواتر اور مسلسل خدا تعالیٰ کی قسمیں کھا کھا کر کرتا اور ہمیں کاذب اور مفتری قرار دیتا تھا۔ آج اس نے خود وہ بات تسلیم کر کے اصلی اور حقیقی نبوت کا دعویٰ کر دیا ہے۔ آپ اس زمانہ کے سارے مخالف لٹریچر کو چھان ماریں آپ کو کوئی ایک تحریر ایسی نظر نہ آئے گی۔ یہ صرف مرزا محمود احمد کی خانہ زاد ایجاد تھی جو ۱۹۱۵ء میں انہوں نے اپنی کتاب "حقیقۃ النبوت" حصہ اول میں بیان کی تھی۔ غالباً اسی بنا پر آج کے مخالف علماء نے ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۸ء کا آخری دور حقیقی نبوت کے دعویٰ کا دور قرار دیا ہے۔

---- بشارت احمد بقا